سلسلۂ مطبوعات: مشاہیرِ اُردو

حفیظ جالندھری

جمیل یُوسف

مقتدرہ قومی زبان پاکستان

ا

حفیظ جالندھری

جمیل یوسف

مقتدرہ قومی زبان ☆ پاکستان
۲۰۱۱ء

پیش لفظ

مقتدرہ قومی زبان نے ادارے کے دوسرے اہم وظائف کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ اُردو کے بنیاد گزاروں کو یاد رکھا جانا چاہیے تا کہ آئندہ نسلوں کو اُن کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات سے آگاہ کیا جا سکے۔ مشاہیر اُردو کے عنوان سے پیش نظر سلسلۂ مطبوعات کا آغاز کیا گیا ہے جس میں اُردو کے محسنوں اور بنیاد گزاروں کی اُردو کے لیے خدمات پر تعارفی نوعیت کی مختصر مگر جامع کتابیں شائع کی جائیں گی۔ اس منصوبے کے تحت مختلف شخصیات پر تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے وقیع کتابیں مرحلہ وار اشاعت پذیر ہوں گی۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری اُردو کے عہد ساز شاعر ہیں مگر ان کی شناخت جہاں شاعری قرار پاتی ہے وہاں قومی ترانے کے خالق کی حیثیت سے ان کا تشخص قومی حوالوں سے اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنی شاعری کے ذریعے ہر طبقے کو متاثر کرتے ہیں وہاں شاہنامۂ اسلام کے ذریعے اپنے علمی امتیاز کو بھی منواتے ہیں۔ اُردو گیت نگاری کے میدان میں حفیظ جالندھری کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بلاشبہ حفیظ جالندھری اُردو کے شعری منظر پر بے حد نمایاں مقام و مرتبے کے حامل شاعر ہیں۔

جمیل یوسف اُردو غزل کے بہت نمایاں شاعر ہیں اور صاحبِ نظر نقاد بھی۔ انھوں نے مقتدرہ قومی زبان کے سلسلۂ مطبوعات مشاہیر اُردو کے لیے ابوالاثر حفیظ جالندھری کے احوال و آثار پر محیط یہ کتاب لکھ کر اُردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب کے ذریعے ابوالاثر حفیظ جالندھری کی شخصیت اور فن کو صحیح تناظر میں سمجھ سکیں گے۔

افتخار عارف ———

۵

پیرایۂ آغاز

نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

حفیظ جالندھری کی سوانح حیات کیا ہے، برصغیر اور خاص کر پاکستان کے علمی و ادبی اور ثقافتی مرکز عروس البلاد، لاہور کی علمی و ادبی تاریخ ہے جو ۱۹۲۲ء سے ۱۹۸۲ء یعنی پورے ساٹھ سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کے ادبی و شعری منظر نامے پر کم از کم نصف صدی تک چھائے رہے۔ پروفیسر مرزا محمد منوّر مرحوم کہا کرتے تھے کہ جب ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ وہ شعروادب کے کُوچے میں ایک نو وارد کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے تو اس وقت سلطنتِ شعر پر حفیظ جالندھری کی حکمرانی تھی۔ اس دور میں حفیظ کا یہ مصرع ایک حقیقت بن کر ملکِ سخن کی فضاؤں میں گونج رہا تھا:

کس کی مجال ہے یہاں ہم سے نظر ملا سکے

بِرصغیر ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں جہاں جہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی تھی شعری ذوق رکھنے والوں کی زبان پر حفیظ کا نام تھا اور علم و ادب سے وابستہ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں حفیظ کا کلام موجود نہ ہو۔

اُردو شعروادب کی تاریخ کا یہ ایک محیّر العقول اور بے مثال واقعہ ہے کہ ایک غیر معروف نوجوان شاعر جو ۱۹۲۲ء میں ۲۲ سال کی عمر میں جالندھر سے بے سروسامانی کے عالم میں لاہور پہنچتا ہے، صرف دو سال کے قلیل عرصے میں لاہور کی ادبی فضا پر چھا جاتا ہے اور اس کی شہرت لاہور کے ادبی حلقوں سے نکل کر خیبر سے لے کر راس کماری اور چٹا گانگ تک ہر طرف پھیلنے لگتی ہے۔ مشہور رسالے ''ساقی'' کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی رقم طراز ہیں:

''جالندھر کا ایک لڑکا لاہور میں آ کر ابوالاثر حفیظ جالندھری بن گیا۔ سیزر کی طرح وہ آیا، اُس نے دیکھا اور فتح کے جھنڈے گاڑ دیے۔ ورنہ اسی لاہور میں پچھلے سو سال میں ایک سے ایک جغادری شاعر آیا اور ٹہل ٹہلا کر چل دیا۔ کسی نے اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ تیرے منہ میں کے دانت ہیں''(۱)

سید ضمیر جعفری اپنے مضمون ''حفیظ، ایک نئی آواز'' میں لکھتے ہیں:

''حفیظ اُردو ادب میں ایک دھماکے کے ساتھ نمودار ہوا۔ یہ دھماکہ نغمہ زار تھا جو اپنے دامن میں اُردو شاعری کے لیے کچھ نئے پھول اور کچھ انوکھے نغمے لایا۔ خوبصورت، شیریں۔ حفیظ نے اُردو شاعری کو پہلی مرتبہ اتنے میٹھے، اتنے پیارے اور اتنے بہت سے گیت دیے جو اس سے پہلے نہیں لکھے گئے تھے۔ ان گیتوں کی مٹھاس ان کے رس رچاؤ، بہاؤ اور سبھاؤ نے یک بارگی ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا''۔ (۲)

پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) نے ان الفاظ میں حفیظ جالندھری کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

''جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے۔ جو کچھ مدت سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے۔ جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں۔ لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں''۔ (۳)

ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر فرماتے ہیں:

''میرے دل میں جو جگہ نغمہ زار کے نظموں کے لیے ہے وہ کسی اور نظم کے

لیےنہیں۔ جوسبک سری جوفرحت افزائی نغمہ زار کے الفاظ ومعانی اور بحور میں ہے وہ اور کہیں نہیں ملتی۔نغمہ زار حفیظ کا شباب ہےاوراس میں شباب کی جملہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔اور جب تک اس عجوزۂ دہر پر شباب مسلط ہےاس کا سکہ جواں ہمت دلوں پر جمار ہے گا۔''(۴)

۱۹۲۴ء میں، جب حفیظ جالندھری کو لاہور آئے ہوئے ابھی صرف دو سال ہی گزرے تھے،ڈاکٹر تاثیر جیسے ثقہ نقاداور نا قابلِ فراموش دانشور نے یہ رائے دی۔ڈاکٹر تاثیر کی یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی ہے۔نغمہ زار میں شامل نظم ''ابھی تو میں جوان ہوں'' حفیظ نے ۱۹۲۲ء-۱۹۲۳ء میں تخلیق کی تھی۔مشاعروں کے سامعین تقاضا کر کر کے حفیظ سے ۱۹۸۲ء تک کہ ان کا سالِ وفات ہے یہ نظم بار بار سُنتے اور سَر دُھنتے رہے۔اب کہ مئی ۲۰۱۰ء ہےتو میں اخبارات میں ایک موبائل کمپنی کی طرف سے دیے گئے اشتہار میں ''ابھی تو میں جوان ہوں'' نمایاں طور پر سرعنوان لکھاہوا دیکھ رہاہوں۔یعنی حفیظ کی یہ نظم ابھی تک فضاؤں میں گونج رہی ہے۔

نغمہ زار کی یہ نا قابلِ فراموش نظمیں تخلیق کرتے وقت حفیظ کوکتنی فراغت اور آسودگی میسر تھی اس کا حال کچھ انہی کی زبانی ملاحظہ ہو:

''متاہل ہوجانے کے بعد میں نے کسبِ معاش کے لیےتھوڑے ہی عرصے میں بیسیوں پاپڑ بیل ڈالے۔ریلوے لائن پر ٹی ٹی،عطرفروشی،کلاہ سازی، خیاطی،فوج کی ٹھیکہ داری،خطوط نویسی، ریلوے سٹیشن پرمزدوری،آٹے کی مشین،متشاعروں کوغزلیں لکھ لکھ کر دینا،سنگرسیونگ مشین کی مینیجری سب کچھ کرڈالالیکن پوری نہ پڑی اور سچ یہ ہے کہ نوکری ہو یا کاروبار، میں کسی کام کا نہ تھا۔رات دِن فکرِ شعر،طبیعت کمزوراور حساس۔''(۵)

حفیظ کی زندگی کے حالات، یہ ایک الگ داستان ہے جس کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا۔ ابھی تو بات ہورہی ہے حفیظ کی شاعرانہ عظمت کی۔

حفیظ کی شاعرانہ عظمت اور اس کی بقائے دوام کے لیے پاکستان کے بے مثل اور باکمال قومی ترانے کا خالق ہونا ہی کچھ کم نہیں ہے، مگر حفیظ کے شعری اور ادبی کارناموں کی فہرست اُردو، فارسی اور انگریزی کے تمام مشہور و معروف شعرا کے مقابلے میں کہیں زیادہ متنوع اور طویل ہے۔ انھوں نے روایت سے ہٹ کر نظم گوئی میں جدت طرازی کی طرح ڈالی ہے۔ ان جیسے گیت کس نے لکھے ہیں۔ اِن گیتوں میں انھوں نے ملکی ثقافت کو اجاگر کیا ہے اور اُردو شاعری میں پہلی دفعہ اپنی دھرتی کا رنگ روپ دکھایا ہے۔ ان کی غزل اپنے ہم عصروں سے کس قدر مختلف اور منفرد ہے۔ ''بچوں کے گیت اور نظمیں'' ان کا ایک ادبی کارنامہ ہے جس کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے پھر ''ہفت پیکر'' کی صورت میں ان کی افسانہ نگاری کی بھی ایک الگ سج دھج ہے۔ ''بقلم خود'' کے عنوان سے انھوں نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں، اس طرح کی انوکھی اور تیکھی، سادہ اور رواں نثر کس شاعر نے لکھی ہے۔ اور ابھی تو ان کے ناقابل فراموش کارنامے شاہ نامہ اسلام کا ذکر باقی ہے۔ تاریخی صداقتوں اور حقائق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کس شاعر نے اس طرح کی نظم لکھی ہے۔ فردوسی اور ہومر تو اس کے مقابلے میں خیال و خواب اور افسانہ و افسوں کی باتیں کرتے رہے ہیں۔ محض داستان گوئی کا سہارا لیتے رہے ہیں مگر حفیظ نے تاریخ اسلام کے مستند واقعات کو شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہنا دیا ہے۔ حفیظ جالندھری جیسی نعت گوئی کس نے کی ہے۔ ایسے سادہ اور دل میں اتر جانے والے اشعار کس نے کہے ہیں اور پھر کمال یہ ہے کہ شعر و ادب کے ان مختلف میدانوں میں ان کا رہوارِ قلم بے مہار و بے مقصد اور بے منزل کبھی سرگرداں نہیں رہا۔ قومی اور ملی مقاصد ہمیشہ ان کے پیش نظر رہے ہیں۔ قومی سطح پر ان مقاصد کے حصول کے لیے موثر پیش رفت میں حفیظ نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے وہ تحریکِ پاکستان کے اہم رہنماؤں اور قائدین میں سے ایک ہیں۔ ''شاہ نامہ اسلام'' کا مسلمانوں پر کیا اثر ہوا اس کا کچھ اندازہ بریگیڈیئر گلزار احمد کے مضمون ''حفیظ'' مطبوعہ ماہ نامہ ''افکار'' حفیظ نمبر سے ہوتا ہے:

''سنہ ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے۔ میں علی گڑھ میں تھا۔ علی گڑھ کا سالانہ مشاعرہ

بڑے پیمانے پر ہوا کرتا تھا۔اس مشاعرہ میں حفیظ کو بھی بلایا گیا۔ مجھے اس وقت تک حفیظ کو سُننے کا موقع نہیں ملا تھا۔علی گڑھ کی وہ شب ہمیشہ یاد رہے گی ۔سحر ہونے کو آئی ہو گی جب کہیں جا کر سامعین نے حفیظ کو دم لینے دیا۔شاہ نامہ اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی درس گاہ کے طلبا کے سامنے حفیظ اپنے خاص انداز میں پڑھ کر سنا رہا ہو۔درست کہ اس وقت مسلمان غلام تھے۔ حکمرانی کی بو باس بھی وہ بھول چکے تھے مگر رجز خواں ان کی دُکھتی رگ سے واقف تھا۔اس نے نہ معلوم کس قدر شب بیداری کے بعد شاہ نامہ لکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر نہ معلوم کتنی طویل راتوں کی عرق ریزی کا نتیجہ تھا جو وہ ان نوجوان مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ احساسِ غلامی بڑا ہی درد آمیز ہوا کرتا ہے۔ یہ رجز خوانی ہمیں احساسِ غلامی سے چھٹکارا دلا رہی تھی۔ پھر وہ کیسے اس دل خوش کن طلسم کے ٹوٹنے پر رضا مند ہوتے۔ جب اس نے اس تصنیف کا سبب بیان کیا تو ہال تحسین و آفرین کے بے ساختہ فقروں سے گونج اٹھا:

گئی دنیا سے آقائی محمدؐ کے غلاموں کی
بھلا بیٹھے ہیں یاد اپنے سلف کے کارناموں کی
ارادہ ہے کہ پھر ان کا لہو اک بار گرماؤں
دلِ سنگیں سخن کے آتشیں تیروں سے برماؤں

اور پھر جب حفیظ نے قطب الدین ایبک والی نظم سنائی تو سامعین کی حالت بیان سے باہر تھی:

وہ جس کی تیغِ ہیبت ناک سے سفاک ڈرتے تھے
وہ جس کے بازوؤں کی دھاک سے افلاک ڈرتے تھے

تخیل مجھ کو لے جاتا ہے اک پُر ہول میداں میں
جہاں باہم بپا ہوتی ہے جنگ انبوہِ انساں میں
نظر آتا ہے لہراتا ہوا اسلام کا جھنڈا
بہر سُو نُور پھیلاتا ہوا اسلام کا جھنڈا
علَم کے سائے میں سلطانِ غازی کا بڑھے جانا
سر دشمن پہ افواج حجازی کا چڑھے جانا
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ غازی مرد ہوں میں بھی
پرانے لشکر اسلام کا اک فرد ہوں میں بھی
مرا جی چاہتا ہے اب نہ اپنے آپ میں آؤں
اسی آزاد دنیا کی فضا میں جذب ہو جاؤں

ہر نوجوان کے دل میں یہی جذبہ بیدار ہو جانا فطری سی بات تھی۔ ایک علی گڑھ ہی کا کیا ذکر ہے۔ حفیظ جہاں جاتا اور شاہ نامہ اسلام سناتا۔ یہی حال ہوتا محکوم قوم کے نوجوانوں کو آزادی کے خواب سچے ہوتے نظر آتے اور وہ کم از کم شاہ نامہ اسلام سنتے وقت یہی محسوس کرتے کہ وہ میدانِ جنگ میں ہیں اور کفار پر غلبہ پا رہے ہیں۔ ایسی ہی محفلیں تھیں جنھوں نے مسلمانوں میں آزاد اسلامی وطن کی آرزو کی چنگاریاں روشن کیں۔''

یہ کتاب حفیظ کی زندگی ہی نہیں بلکہ ان کے فن کی ان تمام جہتوں کا احاطہ کرتی ہے۔ میں پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جناب شاہد علی خاں، مدیر الحمرا، جناب محمد آصف مرزا مدیر دستک اور جناب ضیا الدین نعیم صاحب کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تصنیف میں میری مدد کی۔

جمیل یوسف

فہرست

حفیظ کی زندگی اور شاعری کا سفر

حفیظ ۱۴- جنوری ۱۹۰۰ء کو موجودہ بھارتی پنجاب کے شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ شمس الدین نے ان کا نام محمد عبدالحفیظ رکھا۔ خاندانی پس منظر کا حال بیان کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

''میرا خاندان تقریباً دو سو برس (اب ڈھائی سو برس) پیشتر چوہان راجپوت کہلاتا تھا۔ میرے بزرگ ہندو سے مسلمان ہو گئے اور پاداش میں اپنی املاک وغیرہ کھو بیٹھے البتہ سورج بنسی ہونے کا غرّہ مسلمان ہونے کے باوجود ساتھ رہا، میری ذات تک پہنچا اور ختم ہو گیا۔''(۶)

حفیظ کے بزرگ مغل بادشاہ فرخ سیّر کے دورِ حکومت (۱۷۱۳ء-۱۷۱۹ء) میں اپنا آبائی مذہب ترک کر کے مسلمان ہو گئے تھے۔ بادشاہ نے انھیں جالندھر میں جاگیر عطا کی جو ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے جرم کی پاداش میں ضبط کر لی گئی۔(۷)

حفیظ کے دادا مہر الدین اسلحے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے والد حافظ شمس الدین بھی اسی کاروبار سے منسلک ہو گئے۔ معاشی اور مالی حالات اچھے نہ تھے۔ حفیظ اپنے والد کی دوسری بیوی بتول کی پہلی اولاد تھے۔ سوتیلے بہن بھائیوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ گھریلو حالات ناخوشگوار تھے۔ ان کی والدہ کی ایک قریبی رشتہ دار اور بے اولاد خاتون نے چار سال کی عمر میں انھیں اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ وہ چار سال چار ماہ اور چار دن کے تھے جب محلے کی مسجد میں ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے حفیظ رقم طراز ہیں:

''میں ننھا سا تھا جب محلے کی قدیم مسجد میں داخل کرا دیا گیا۔ میں یقیناً اس

زمانے میں ذہین لوگوں میں شمار ہوتا تھا کیونکہ میں نے چھ برس میں ہی
ناظرہ قرآن شریف پڑھ لیا۔ بہت سے سُورے زبانی یاد کر لیے۔ کریما
اور مامقیما رٹ لیے۔"(۸)

اس کے بعد انھیں مشن سکول میں داخل کرایا گیا جہاں سے ان کے اپنے قول کے مطابق وہ دوسرے درجے سے بھاگ نکلے۔ پھر میونسپل سکول میں داخلہ لیا۔ چوتھی جماعت میں وہاں سے بھاگے۔ پھر آریہ سکول اور پھر مشن سکول کی باری آئی۔ مگر ان کی تعلیم کا حال ان کے اپنے الفاظ میں:

"حساب سے میری جان جاتی تھی۔ ہر روز حساب کے وقت بھاگ جاتا تھا
دوسرے دن پٹتا تھا۔ یہ بھاگنے اور پٹنے کی جنگ چار سال تک جاری رہی۔
آخر پٹنے پر بھاگنا غالب آیا اور میں ہمیشہ کے لیے بھاگ نکلا۔"(۹)

شعر و ادب سے فطری اور پیدائشی لگاؤ تھا۔ پانچ چھ سال کی عمر میں ہی محلے میں منعقد ہونے والی میلاد شریف کی محفلوں میں نعتیں اور مسدس حالی کے اشعار ترنم سے پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ان دنوں کا ایک دلچسپ واقعہ حضرت حفیظ نے یوں بیان کیا ہے:

"یہ باتیں میری سمجھ سے بلند تھیں۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میری نصاب کی
نظمیں اور دوسرے موزوں بول جو سمجھ میں آئے بغیر کانوں کو بھلے لگتے
تھے ان کو مجھ ایسے انسان ہی گھڑتے ہیں۔ یہ بھید مجھ پر اچانک کھلا۔ وہ
اس طرح کہ ایک دن میں ہم جولی لڑکوں کے ساتھ گیند بلا کھیل کر پلٹ
رہا تھا۔ سرِ راہ ایک حویلی کے صحن میں بہت سے لوگ جمع پائے۔ شور سُن
کر ہم بھی جا گھسے۔ محفل کے درمیان ایک مرد معقول 'کریما بہ بخشا' کی
بولی میں جو مجھے مسجد میں پڑھائی جا چکی تھی، ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ سُنا رہا تھا۔
سُننے والے بھی واہ واہ سبحان اللہ خوش گفتی، دُرسفتی کہتے تھے۔ سَر ہلاتے،

زانوں پر ہاتھ مارتے اور لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے۔ بے اختیار ہنسی پھوٹی۔ میں اور میرے ساتھی بیچ میدان کود کر وہی حرکتیں کرنے لگے، جو دوسرے بوڑھے کر رہے تھے۔ لیکن فوراً ہی چپتائے اور دھکیائے گئے۔ تھپڑ سے میری نکسیر پھوٹ پڑی مگر اس پٹائی کے باوجود ہم اپنے گھر تک کرچستی ڈرستی کی مہارانی سے باز نہ آئے۔ گھر پر والد نے سوجا ہوا منہ دیکھ کر اور چیر نمٹھو کیا ہوتا مگر دادا آڑے آ گئے اور دادا ہی کی تقریر سے پتا چلا کہ وہ کریما بہ بخشا کی بولی بولنے والا فارسی کا ایک بڑا شاعر ہے۔ جالندھر ہی کا رہنے والا ہے۔ دادا کے دوست شیخ سکندر بخش کا لڑکا ہے۔ بچپن میں سب اسے مسکت کہتے تھے۔ تکیں جوڑا کرتا تھا۔ اب دیوانِ حافظ کی ٹکر کا ہے۔ ماں باپ نے غلام قادر نام رکھا تھا گرامی خود بن گیا۔ میرے ماں باپ کا ہم مسجد تھا، اب دکن کے بادشاہ کے دربار میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی جالندھر آتا ہے۔ بے فکرے وکیل، وکلا اور فارسی کے علماء محفل جماتے ہیں۔ اس کی فارسی سن کر واہ واہ کرتے ہیں۔ دیکھا دیکھی اور لوگ بھی تکیں جوڑنے لگے۔ مگر توبہ جی کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔ سَنَد رہے کہ یہ عرفان یا گیان مجھے ۱۹۰۷ء میں اپنی عمر کے ساتویں برس کسی پیڑ کے تلے آنکھیں بند کر کے سمادھی لگانے سے نہیں محض ایک محفلِ مشاعرہ میں پہلی مرتبہ بغیر اذن جا گھسنے، سمجھ میں نہ آنے والی بولی پر داد دینے والوں کی نقل اتارنے اور تھپڑ کھا کر پھوٹی ہوئی نکسیر لیے ہوئے نکالے جانے پر ہوا۔ اس عرفان کے دوسرے تیسرے دن گھر کے ایک گوشے میں بیٹھے کاٹھ کی تختی اور مشق اور خوش خطی کی کاپی پر میری پہلی نظم منصۂ شہود پر جلوہ آراء ہوئی جسے میں دوسرے دن مدرسے لے گیا۔ ہم

جماعتوں کو بڑے فخر سے سناتا ہوا پکڑا گیا۔ مولوی فتح خان سے چانٹے
کھائے اور اپنی شاعری کی پہلی دادیوں پائی۔" (۱۰)

آریہ سکول کے دنوں میں ان کے ایک استاد ماسٹر گوپال داس نے ان کی طبیعت کی موزُونی اور شعر کی جانب ان کے فطری رجحان کو بھانپ کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ حفیظ نے بتایا کہ ماسٹر گوپال داس نہ صرف اُردو کے اچھے اور شفیق استاد تھے بلکہ علم نجوم بھی جانتے تھے۔ انھوں نے حفیظ کا ہاتھ دیکھ کر پیش گوئی کی کہ:

"ایک وقت آئے گا جب تم بہت مشہور ہو جاؤ گے اور بڑے بڑے
تمھارے سامنے سرِ تسلیم خم کریں گے۔" (۱۱)

ریاضی کے خوف سے حفیظ سکول سے تو بھاگ نکلے مگر جہاں تک اُردو زبان و ادب کے مطالعے کا شوق تھا وہ انھیں اس وقت بھی بیماری کی طرح لاحق تھا:

"اُردو نظم ہو یا نثر جو کچھ ہاتھ میں آیا، سمجھ میں آئے نہ آئے میں اسے پی
جانے لگا۔ کہیں سے ایک پھٹی ہوئی جلد طلسم ہوشربا کی مل گئی۔ چھپا کر ہتھیا
لایا۔ امیر حمزہ کے کارنامے اور عمرو عیار پڑھا کرتا۔ اس دفترِ بے پایاں کی اور
جلدیں بھی گھر سے پیسے چُرا کر منگالیں۔ مسدس حالی مل گئی تھی۔ پڑھتا اور
خواہ مخواہ روتا۔ سکول میں اُردو کے سوا سب مضامین میں صفر تھا۔" (۱۲)

ابھی پندرہ سولہ سال کے ہی ہوئے تھے کہ گھر والوں نے شادی کے بندھن میں باندھ دیا، اس خیال سے کہ ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا اور حفیظ قافیہ ردیف اور شعر و شاعری کے چکر سے باہر نکلیں گے۔ انھیں کاروبار میں لگانے کے لیے عطر اور خوشبوئیات کی دکان کھول دی۔ حفیظ کے اپنے الفاظ میں:

"یہ دکان عشق و محبت کی دکان ثابت ہوئی۔ شاعروں کا جمگھٹا رہنے لگا۔
رنگ رنگ کے حسین صورت لوگ عطر کی قیمتی شیشیاں مسکرا مسکرا کر اٹھانے

لگے۔ گرمیٔ بازار ایسی بڑھی کہ دکان بڑھانی پڑی......''(۱۳)

علی سفیان آفاقی صاحب راوی ہیں کہ:

''حفیظ کی ادبی زندگی میں ۱۹۱۷ء میں جالندھر شہر میں منعقد ہونے والا ایک مشاعرہ ناقابل فراموش اہمیت رکھتا ہے۔ حکومت کی طرف سے شہر میں نمایاں جگہوں پر اس مضمون کے اشتہار چسپاں کیے گئے کہ پہلی عالمی جنگ کے تناظر میں ایک انعامی مشاعرہ کرایا جا رہا ہے۔ جالندھر کی کمشنری کے تمام شاعروں کو اس میں شرکت کی عام دعوت دی گئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ جو شاعر 'جنگ اور امن' کے موضوع پر سب سے اچھی غزل یا نظم پیش کرے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ ماسٹر گوپال داس نے بطور خاص حفیظ کی توجہ اس اشتہار کی جانب دلائی اور کہا 'حفیظ! تم بھی اس مشاعرے میں حصہ لو'۔ حفیظ نے حیرت سے جواب دیا 'ماسٹر جی میں اور مشاعرہ۔ میں نے تو آج تک کسی مشاعرے میں حصہ نہیں لیا پھر اس انعامی مقابلے میں تو بڑے بڑے شاعر آئیں گے۔ میں کیا اور میری شاعری کیا'۔ ماسٹر گوپال داس کہنے لگے 'حفیظ تم بڑی اچھی غزل اور نظم لکھ سکتے ہو' مگر حفیظ آمادہ نہ ہوئے۔ ماسٹر جی حفیظ کا ہاتھ پکڑ کر انھیں ان کی والدہ کے پاس لے گئے۔ انھوں نے حفیظ کی والدہ سے کہا 'آپا جی آپ اسے کمرے میں بند کر دیجیے اور جب تک یہ ایک نظم یا غزل نہ لکھ لے اسے باہر نہ نکالیے۔ یہ بہت اچھی نظم لکھ سکتا ہے اسے مقابلے کے اس مشاعرے میں ضرور حصہ لینا چاہیے'۔ ماسٹر گوپال داس کی خواہش اور ہدایت پر حفیظ کی والدہ نے انھیں کمرے میں بند کر دیا۔ پورا نصف دن وہ اس قیدِ تنہائی میں رہے۔ شام تک جب انھوں نے اپنی امی جان کو آواز

دی کہ غزل اور نظم لکھ چکا ہوں تو دروازہ کھولا گیا۔ ماسٹر جی بھی تشریف لے آئے۔ جب انھیں پتہ چلا کہ حفیظ نے نظم اور غزل لکھ لی ہے تو بہت خوش ہوئے اور حفیظ کو اپنے ساتھ مشاعرے میں لے گئے۔ اس مشاعرے میں جالندھر کمشنری کے سب معروف شاعر آئے ہوئے تھے۔ جب حفیظ کا نام پکارا گیا اور وہ سٹیج پر جانے کے لیے اٹھے تو وہاں پر موجود سامعین اور شعرا ایک مُنحنی سے دُبلے پتلے لڑکے کو انعامی مقابلے کے اس مشاعرے میں شرکت کے لیے آنے پر مسکرا دیے۔ حفیظ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ سٹیج پر پہنچے اور بڑے دلنشین ترنم سے اپنی نظم پڑھی۔ نظم اتنی اچھی تھی اور پھر اس کی ادائیگی اس قدر کمال کی تھی کہ حفیظ کو خوب داد ملی۔ نظم گوئی کے اس مقابلے میں حفیظ کی نظم کو بہترین قرار دیا گیا اور انھیں ایک طلائی تمغہ بطور انعام ملا۔ اس کے بعد غزل کا دور شروع ہوا۔ اس میں بھی حفیظ کی غزل ہی اول رہی اور انھیں ایک سو روپے نقد انعام سے نوازا گیا۔ لوگوں کو حفیظ کے کلام اور انعام پر اس قدر خوشی ہوئی کہ انھوں نے حفیظ کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور حفیظ زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے جلوس کی شکل میں نکل کھڑے ہوئے۔ حفیظ کی شہرت سارے شہر میں پھیل گئی۔ گویا حفیظ جالندھری کے دور کا آغاز ہو گیا۔''

یہ واقعہ حفیظ کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''میں جسمانی محنت و مزدوری میں لگا ہوا تھا کہ شہر میں ایک دنگل ہوا۔ کمشنری جالندھر کے پانچ ضلعوں سے شاعر کشتی لڑنے آئے۔ آریہ اینگلو ورنیکلر سکول کے ماسٹر گوپال داس کی انگیخت پر طرحی غزل اور متعین مضمون پر ایک نظم راتوں رات میں نے لکھی۔ ماسٹر جی مجھے میرے گھر

سے اپنے ساتھ دنگل میں لے گئے۔ بھاری بھرکم شاعروں کے مقابلے میں اکھاڑے میں اُترتے وقت میری عمر اور وضع پر سب ہنسے لیکن میں فسانۂ آزاد کا صف شکن بٹیر ثابت ہوا۔ پہلا انعام سونے کا تمغہ، دوسرا انعام سو روپے، دونوں مجھی کو مل گئے۔ گوپال داس جی کی قیادت میں پنڈت ہری چند کے ساتھی طلبہ مجھے کندھوں پر اٹھا کر شہر کے بازاروں میں دہائی دیتے پھرے۔ اب میں تمغہ یافتہ شاعر ہو گیا مگر شاعر برادری بے استاد کہتی تھی۔ خوش قسمتی سے حضرت گرامی دربار دکن سے وظیفہ (پنشن) لے کر وطن میں آ گئے اور میں حمید جالندھری (مالک مکتبہ کارواں کچہری روڈ، لاہور) کے مرحوم ماموں جان کی معیت میں مٹھائی اور پیازی رنگ کی ایک پگڑی پر پانچ روپے رکھ کر ملک الشعرائے فارسی کے حضور روانہ ہوا۔ اب بے اُستاد نہ رہا۔ مرحوم اصلاح کی بجائے شعر کو سہل ممتنع بنانے اور بار بار غور کرنے پر زور دیتے رہے۔ فرماتے ''میاں تقلید نہ کرو، اپنی ذات کو باہر لاؤ۔''(۱۴)

گھر والوں نے یہ سوچ کر کہ شاید شادی ہو جانے کے بعد حفیظ کی آوارگی اور بیکاری میں کوئی فرق پڑ جائے، سولہ سال کی عمر میں ان کی شادی کر دی۔ اس طرح فکرِ سخن کے ساتھ بیوی کی دیکھ بھال اور اس کے نان نفقہ کی فکر بھی آ دامن گیر ہوئی۔ انھیں اپنی رفیقۂ حیات کی دلجوئی کا خیال بہرحال ملحوظِ خاطر تھا۔ مشاعرے میں سونے کا تمغہ انعام ملا تو گھر جانے سے پہلے سنار کی دکان پر گئے۔ سونے کے تمغے کے بدلے وہاں سے بیوی کے لیے زیور لیا اور اس طرح اپنی بیوی کو بھی اپنی خوشی میں شریک کر لیا۔

۱۹۱۹ء میں حفیظ انگریزوں کے خلاف نظم لکھنے اور اسے ایک جلسۂ عام میں سنا کر لوگوں کو انگریزی حکومت کے خلاف اشتعال دلانے کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے۔ تین ماہ جیل میں

رہے۔ یہ واقعہ حفیظ کی زبانی سُنیے:

''میری عمر انیس (۱۹) برس کی تھی۔ جلیانوالہ باغ کی فائرنگ سے کچھ دن پہلے امرتسر کانگریس کے زیراہتمام ایک جلسہ ہوا تھا۔ اس میں، میں نے ایک نظم پڑھی تھی۔ اور اس، اور سے پہلے میں کچھ اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میرے والد کے ڈاکٹر کچلو سے بڑے تعلقات تھے۔ کچلو جالندھر آئے تو انھوں نے والد صاحب سے کہا۔ ''سُنا ہے تیرا بیٹا بھی شاعر ہے اور اچھے شعر کہتا ہے۔''

والد صاحب نے کہا ''اس نے کیا شعر کہنے ہیں۔ اِدھر اُدھر سے لکھوا لیتا ہوگا مگر سُنا تو میں نے بھی ایسا ہی ہے کہ وہ مشاعروں میں پڑھتا ہے اور اچھے شعر کہتا ہے۔''

''اسے ذرا بلایئے۔''

میں حاضر ہوا تو کچلو نے مجھے پاس بٹھا کر کہا ''برخوردار شاعری ایسی کرو جو وطن کے کام آئے۔ ہجر و وصال کے قصے دہرانے کا یہ وقت نہیں۔''

''بہت اچھا۔''

''پھر یہ امتحان کب دو گے۔''

''جب آپ امتحان لیں گے۔''

تین دن کے بعد امرتسر میں ایک جلسہ ہو رہا ہے اس کے لیے ایک نظم لکھو جس میں بیداریٔ وطن کے لیے تڑپ ہو۔ انگریزوں سے نفرت کا اظہار ہو اور وہ نظم ہر ایک کے سینے میں آگ لگا دے۔''

چنانچہ میں نے نظم لکھی اور پڑھی۔ کوئی رام جی داس، مِل اونر تھے، ان کی صدارت میں اور ان کے ہی سنیما ہال میں وہ نظم پڑھی گئی۔ نظم بڑی تیز اور

> جذباتی تھی خوب بندے ماترم کے نعرے لگے۔ خوب واہ واہ ہوئی۔ میری
> نظم کے بعد کچلو نے تقریر نہ کی۔ کچھ تو وہ دن رات کام کرنے کی وجہ سے
> تھکے ہوئے تھے کچھ انھیں میری حوصلہ افزائی مطلوب تھی۔ اس لیے وہ یہ
> کہہ کر بیٹھ گئے ''حفیظ نے جو کچھ کہا ہے اور جس جذبے سے کہا اس کے
> بعد مجھے کچھ نہیں کہنا۔''

میرے بعد صاحبِ صدر نے تقریر کی اور اس کی پاداش میں مجھے اور رام جی داس کو گرفتار کرلیا گیا۔(۱۵) کچھ عرصے بعد حفیظ کو تلاشِ روزگار کے دوران اوکاڑہ میں سنگر مشین بیچنے کا کام مل گیا۔ وہاں چلے گئے۔ اوکاڑہ سے منٹگمری (ساہیوال) قریب تھا۔ وہاں نشتر جالندھری کی رہنمائی میں ادبی سرگرمیاں زوروں پرتھیں۔ حفیظ ان تقریبات میں شرکت کرتے۔ بہرحال انھیں سنگر مشین کی منیجری راس نہ آئی نہ منٹگمری کے مشاعروں اور ادبی سرگرمیوں سے ان کی پیاس نہ بجھی۔ ۱۹۲۱ء میں جالندھر واپس چلے گئے۔ وہاں مولانا گرامی کی سرپرستی میں ماہنامہ ''اعجاز'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ نکالنے کا پروگرام بنایا جس کے اخراجات کے لیے دادی اماں سے وراثت میں ملے ہوئے ایک مکان کو چپکے سے والد کو بتائے بغیر حفیظ نے گروی رکھ دیا۔ اور اپنے استاد محترم گرامی سے متعدد مشاہیر ادب کے نام تعارفی خط لے کر ملک گیر دورے پر چل نکلے۔ لاہور، دہلی، لکھنؤ کے کئی شعرا اور ادبا سے ملاقاتیں کیں۔ لاہور میں حضرت علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اقبال گرامی کے شاگرد تھے۔ اپنے استاد کا تعارفی خط دیکھ کر حفیظ کے ساتھ بڑی شفقت سے ملے۔ مصورِ مشرق حضرت عبدالرحمٰن چغتائی سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات چغتائی اور حفیظ کی زندگی بھر کی گہری اور محبت بھری دوستی کا حرفِ آغاز ثابت ہوئی۔ لاہور میں حفیظ عبدالمجید سالک سے بھی ملے۔ دہلی میں حکیم اجمل خان، عبدالحلیم شرؔر اور امجد دہلوی سے ملے۔ لکھنؤ میں صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، یگانہ چنگیزی، شوق قدوائی، ہوش بلگرامی، اثر لکھنوی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری سے ملاقاتیں کیں۔ یہ ان مشاہیر سے حفیظ کا پہلا تعارف تھا

اور یہی ماہنامہ ''اعجاز'' کے اجراء کی کوشش کا ثمر بھی۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں رسالہ کا اجراء ہوا۔مگر یہ رسالہ تین ماہ کے بعد دم توڑ گیا۔مکان گروی رکھ کر جو رقم ہاتھ آئی تھی وہ حفیظ کا ایک مہمان شاعر پنڈت سوہاتوی لے اُڑا۔اب آگے کا حال حفیظ کے اپنے الفاظ میں بہتر ہوگا۔

''مکان گروی رکھنا کب تک مخفی رہتا۔والد نے میری بیوی اور میری شیر خوار بچی کے سامنے میرے سر کو جوتوں سے نوازا۔اب کے بہت شرم آئی۔اپنی بیوی کو اس کے میکے میں لاہور چھوڑ کر پیدل کشمیر چلا گیا......''(۱۶)

کشمیر کی پیدل سیر و سیاحت کے پیچھے حفیظ کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی جاگزیں تھا کہ اس نامرادونا کام زندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے کسی پہاڑ کی اچھی سی چوٹی کا انتخاب کیا جائے۔مگر کشمیر کے دلپذیر اور دل نواز مناظر اور حسن فطرت کی بے حجابی نے حفیظ کے دل میں جینے اور زندہ رہنے کی اُمنگ از سرِ نو پیدا کر دی۔ان کا دل حسن فطرت کی دلکشی اور دلفریبی سے کِھل اُٹھا اور بے ساختہ ان کی زبان معجز بیان سے یہ مصرع ٹپک پڑا ''ابھی تو میں جوان ہوں'' جو بعد میں ایک نا قابلِ فراموش اور لافانی نظم کا محرک بنا۔خوش قسمتی سے شملہ میں حفیظ کو حکیم فیروز طغرائی مل گئے۔ان کی مہمان نوازی اور صحبت نے حفیظ کو نئے عزم سے سرشار کر دیا۔شعر وسخن کی لذت میں سرمست وہ لاہور واپس پہنچے۔

کشمیر کے سفر کے دوران حفیظ نے کشمیر پر اپنی پہلی نظم لکھی ''چشمہ دوناگ پر ایک آنسو''۔ یہ نظم ''شبابِ اُردو'' لاہور میں شائع ہوئی۔شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ ان دنوں میٹرک کے طالب علم تھے۔ان کا قول ہے کہ اس نظم نے سب سے پہلے ان کی روح میں کشمیر کو آزاد کرانے کی چنگاری سلگائی تھی۔

شیخ عبداللہ اور حفیظ جالندھری کے تعلقات کا کچھ حال مدیر ''نقوش'' محمد طفیل کے قلم سے ملاحظہ ہو:

''جب شیخ عبداللہ پنڈت نہرو کے ایما پر پاکستان پہنچے تھے کہ کشمیر کے مسئلے پر ابتدائی گفتگو ہو جائے تو حکومت پاکستان نے شیخ صاحب کے لیے افسر

مہمان داری جنھیں مقرر کیا تھا، وہ حفیظ صاحب تھے۔ عرصے کے بعد دونوں یار ملے تھے خوب گھل مل کے ملے۔ شیخ صاحب جتنے دن پاکستان میں رہے انہی کے جلو میں رہے۔

قیام پاکستان سے پہلے بھی شیخ صاحب جب لاہور آتے تھے، حفیظ صاحب کے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔ اس لیے میرا ابھی شیخ عبداللہ کے متعلق استفسار ضروری تھا۔ پوچھا:

''ان سے کیسے تعلقات ہیں۔ کب سے دوستی ہے؟''

''بھائیوں جیسے تعلقات ہیں۔''

''کب سے۔''

''غالباً ۱۹۲۲ء سے۔ میں نے کشمیر کے بارے میں ایک نظم لکھی تھی۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب میں پہلی بار کشمیر گیا تھا۔ وہاں وہ نظم کہی تھی جو اب میرے کسی مجموعے میں نہیں۔ اُسے پڑھ کر ایک طالب علم قسم کا شخص میرے پاس آیا تھا۔ کہنے لگا۔ ''آپ کی نظم نے تو میرے دل میں آگ لگا دی ہے۔''

''یہ میرے دل کی آگ ہے۔ اگر آپ کے بھی دل میں لگی ہے تو مجھے خوشی ہوئی۔''

جب وہ صاحب جانے لگے تو اس نے کہا ''میرا نام عبداللہ ہے۔ سکول میں پڑھتا ہوں۔''

کافی عرصے کے بعد ایک دن میں نے اخبار میں پڑھا کہ شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ وہی لڑکا ہے جو مجھے ایک بار ملا تھا۔ میں تو اُسے بھول چکا تھا مگر میں اس نام سے ایک کشمیری لیڈر کی حیثیت سے خوب آشنا تھا۔ تقریریں پڑھتا تھا۔ جلسے جلوسوں کا حال جانتا

تھا۔ ایک دن میں نے سُنا کہ شیخ صاحب مجھے ملنے کے لیے چلے آ رہے
ہیں۔ میں حیران۔ کئی شہری اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں
کہ شیخ صاحب آ گئے، شیخ صاحب آ گئے۔ اتنے میں ایک شخص میرے
قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور کہا ''مجھے پہچانا۔''(۱۷)

جالندھر سے حصول تعلیم کے لیے لاہور آیا ہوا ایک طالب علم خاطر ہریانوی مل گیا۔ خاطر ہریانوی شاعری میں حفیظ کا شاگرد رہ چکا تھا۔ وہ حفیظ کو ایک مشاعرے میں لے گیا۔

حفیظ چونکہ خود چوتھی جماعت سے آگے نہیں جا سکے تھے۔ ان پر لاہور کے پروفیسر اور ایڈیٹر قسم کے جغادری شاعروں کا بڑا رعب تھا۔ سامعین کی پچھلی صف میں کسی بنچ پر حفیظ کو جگہ ملی۔ خاطر ہریانوی نے ان کا نام بھی سیکرٹری مشاعرہ تک پہنچا دیا۔ حفیظ کو نومشق پنجابی شاعروں میں شامل کرلیا گیا۔ اس وقت علامہ تاجور نجیب آبادی کے زیر اثر لاہور میں اہل زبان اور پنجابی شعرا میں خاصی معرکہ آرائی جاری تھی۔ تاجور نے اپنے شاگرد پیشہ شاعروں کا ایک بڑا مضبوط جتھا بنایا ہوا تھا جو کسی اور شاعر کو مشاعرے میں جمنے نہیں دیتا تھا۔ بہرحال جب حفیظ نے اپنا کلام سنایا تو سامعین کی طرف سے ایک غزل اور کی آوازیں بلند ہوئیں۔ حفیظ نے دوسری غزل بھی پیش کی۔ خاطر ہریانوی کا بیان ہے کہ اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے کسی بزرگ شاعر کی زبان سے نکلا ''یہ تو چھا گیا ہے''۔ حفیظ کا اپنا اصرار ہے کہ اس شاعر نے گالی سے اپنی داد کا آغاز کیا تھا اور کہا تھا...... چھا گیا ہے۔ اس مشاعرے کے بعد جلد ہی حفیظ جالندھری سر شیخ عبدالقادر، حکیم احمد شجاع، مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی قربت اور شفقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہی محفلوں میں ان کی ملاقات پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس)، سید امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر سے ہوئی۔ انھوں نے حفیظ کو اپنی بزمِ خاصان ادب کا رکن بنالیا۔ سر شیخ عبدالقادر اور پروفیسر احمد شاہ بخاری نے حفیظ میں جوہرِ قابل دیکھ کر ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور ہمیشہ کے لیے حفیظ کے سرپرست اور مربی بن گئے۔ حفیظ نے خود لکھا ہے:

''سید احمد شاہ بخاری پطرس اور ان کے برخوردار ذوالفقار علی بخاری میرے یارانِ دلنواز بن گئے۔ان کا مذاقِ سخن حوصلہ افزائی اور نقادانہ نگاہ میری ترقی کا باعث بنے۔''(۱۸)

ادھر لاہور کے خاصانِ ادب میں حفیظ کی پذیرائی کا یہ عالم اور دوسری طرف گز رگز ر ان کا حالِ زار۔حفیظ کے اپنے بیان کے مطابق وہ ریلوے سٹیشن پر جاتے اور لائسنس یافتہ قلیوں کی نظروں سے بچ بچا کر مسافروں کا سامان اُٹھاتے تا کہ رات گھر جاتے وقت بیوی بچوں کے لیے چار پیسے بن جائیں۔یہاں حفیظ کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''والدین کا نالائق بیٹا تو ثابت ہو ہی چکا تھا۔اب سسرال کا نکھٹو داماد بنتے میری شرمِ دامن گیری کی نوشتۂ تقدیر نے لاج رکھ لی۔جس شاعری نے مشکل میں ڈالا تھا اسی کو مشکل کشائی کا حکم ملا۔ایک نعتیہ مشاعرہ اندرون بھاٹی دروازہ زیر صدارت خان احمد حسین خان (مشہور ناولسٹ) مالک و مدیر ماہنامہ ''شباب اُردو'' لاہور منعقد ہوا۔مصرع طرح پر میری سادی سی نعت زیادہ ہی پسند کر لی گئی اور میں ساٹھ روپے ماہوار کے ''وعدے'' پر دوسرے روز ''شباب اُردو'' کا نائب مدیر بن گیا۔وعدہ اس لیے لکھا گیا ہے کہ یہ وعدہ ہی تھا...... یہ خبر سسرال آ کر میں نے اس طرح سنائی جیسے پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر بن گیا ہوں......''(۱۹)

مشن کالج کے ہوسٹل میں حفیظ کا بچپن کا یار پنڈت ہری چند رہتا تھا۔جو بعد میں بطور شاعر پنڈت ہری چند اختر کے نام سے مشہور ہوا۔پنڈت ہری چند اختر کے اس نعتیہ شعر کو قبول عام اور شہرت دوام کا نصیب ہوا ہے:

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

پنڈت ہری چند اختر حفیظ کی شاگردی کا دم بھرتا تھا۔ حفیظ کا شام کا ساتھی تھا۔ حفیظ رسالے کے دفتر سے فارغ ہو کر اس کے پاس پہنچ جاتے۔ پنڈت کا ایک دوست دیوی دیال گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ ڈیمانسٹریٹر تھا۔ سلطان کھوسٹ جومیو کالج آف آرٹ میں تھا اور حفیظ اور پنڈت کا جالندھر کے زمانے کا دوست تھا ان سے آملتا اور یہ دوست مال روڈ انارکلی اور اندرون شہر مٹر گشت کیا کرتے۔ ان کی ملاقات مرتضیٰ احمد میکش سے ہو گئی۔ وہ بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے سلسلے میں لاہور میں تھے۔ میکش نے ان سب کی ملاقات مولانا غلام رسول مہر سے کرا دی۔ مولانا غلام رسول مہر، مولانا ظفر علی خان اور عبدالمجید سالک کی گرفتاری کے بعد ''زمیندار'' کے ایڈیٹر تھے۔ انہی دنوں حفیظ کی ملاقات اُردو کے ثقہ ادیب حکیم فقیر محمد چشتی سے ہوئی۔ کم ہی کسی پنجابی کو اُردو پر وہ عبور حاصل تھا جو حکیم صاحب کا طُرۂ امتیاز تھا۔ وہ حفیظ کی شاعری پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ دل و جان سے حفیظ کے قدر دان بن گئے۔ حفیظ کے حلقۂ احباب کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا تھا۔ حکیم احمد شجاع پاشا سے بھی تعارف ہو گیا۔ ''ہزار داستان'' اور ''نونہال'' دو رسالے حکیم صاحب کی زیرِ نگرانی شائع ہو رہے تھے۔ رسالہ ''شباب اُردو'' کی ادارت کے دوران ہی حفیظ کا آمنا سامنا سید عابد علی عابد سے بھی ہوا۔ سید صاحب خود حفیظ کے دفتر آئے اور اپنا ایک طبع شدہ ڈرامہ تبصرے کے لیے دیا۔ اثر صہبائی اس زمانے میں یونیورسٹی لاء کالج میں وکالت کے طالب علم تھے۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ حفیظ مولانا گرامی کی سفارشی چٹھی کے طفیل علامہ اقبال سے پہلے ہی نیاز حاصل کر چکے تھے۔ جسٹس سر شیخ عبدالقادر کی نظر التفات حفیظ پر انجمن اربابِ علم کے مشاعرے میں پڑی۔ یہاں وہ بطور صدر رونق افروز تھے۔ حضرت علامہ اقبال نے بھی اس مشاعرے میں شرکت فرمائی۔ انجمن اربابِ علم پر علامہ تاجور نجیب آبادی چھائے ہوئے تھے۔ یہ دراصل تاجور صاحب کے شاگردوں کی انجمن تھی جس میں صرف اہلِ زبان شعرا اور خصوصی طور پر تاجور نجیب آبادی کے شاگردوں کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ جسٹس سر عبدالقادر اور علامہ اقبال سے نیازمندی اور ان کی دامن گیری تو انجمن کی مجبوری تھی ورنہ عموماً تاجور نجیب آبادی

پنجابی شعرا کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ شہر میں ہونے والے مشاعروں پر مولانا تاجور نجیب آبادی کا اتنا غلبہ تھا کہ حفیظ کے الفاظ میں:

''لاہور میں آئے ہوئے اہلِ زبان اور پنجابی بے زبان حوصلہ افزائی اور سخن سرائی کے لیے مولانا اور ان کے جتھے کے محتاج تھے۔''(۲۰)

مشاعروں میں تاجور نجیب آبادی اور اس کے شاگردوں کی فوج ظفر موج کی اجازت اور پشت پناہی کے بغیر ہی بلکہ ان کے حسد اور مخالفت کے باوجود حفیظ کو بڑھ چڑھ کر داد ملنے لگی تو ان لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ کسی استاد کا کلام ہاتھ لگ گیا ہے۔ جسے حفیظ اپنے خداداد ترنم سے پڑھ کر مشاعروں پر چھا جاتا ہے۔ اخباروں میں مشاعروں کی جو روداد چھپتی اس میں تاجور اور ان کے ہم نوا حفیظ کو شاعر کی بجائے 'ڈوم' لکھواتے۔ حفیظ کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی کو شیخ عبدالقادر اور پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) جیسے رہبر اور سر برآوردہ زعما موجود تھے۔ حفیظ لکھتے ہیں کہ:

''اس حاسدانہ کمینگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ سر عبدالقادر، پروفیسر بخاری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے مربی و محسن بن گئے۔''

اب حفیظ کے قدم لاہور میں جم گئے۔ ماہنامہ ''شباب اُردو'' کے بعد یکے بعد دیگرے ہزار داستان، نونہال، تہذیب نسواں، پھول، مخزن اور ہمایوں کی ادارت کے منصب پر فائز ہوئے۔ مولانا عبدالمجید سالک قید سے رہا ہوئے تو انھوں نے مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ مل کر ''زمیندار'' اخبار سنبھالا اور حفیظ کو بھی ''زمیندار'' کے دفتر میں پارٹ ٹائم کا کام سونپ دیا۔ ۳۵ روپے ماہانہ اعزازیہ مقرر ہوا۔ حفیظ کا کام قابلِ اشاعت مسودات کی نوک پلک درست کرنا تھا۔ اب کسی نہ کسی طرح گزر اوقات ہونے لگی۔ حفیظ اب دو بیٹیوں کے باپ بن چکے تھے۔ انھوں نے اندرون لاہور ایک عمارت کی دوسری منزل پر ایک ڈربہ نما کمرہ کرائے پر لیا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں رہنے لگے۔ اب سسرال کے ہاں پڑے رہنے کی شرمندگی بھی دور ہوئی۔ اُردو بازار کے کئی کتب فروش حفیظ سے اُردو کی نصابی کتابوں کی اشاعت میں بھی مدد لینے لگے۔

تھوڑے بہت معاوضے کے عوض کتابت کی غلطیاں درست کرنا بعض اوقات مسودوں کی اصلاح اور عبارت کی درستگی کا کام بھی کرنا پڑتا۔ حفیظ کے عزیز شاگرد دوار کا داس شعلہ نے اپنی کتاب ''میرا حفیظ'' میں انہی دنوں کا واقعہ درج کیا ہے:

> ''عید سے ایک دن پہلے شام کے چار بجے کے قریب حفیظ صاحب میرے یہاں آئے۔ خلاف معمول ملازم کی معرفت مجھے باہر طلب فرمایا۔ میں گھر پر تھا۔ آیا تو وہ سڑک پر سائیکل تھامے کھڑے تھے۔ گھبرائے گھبرائے سے تھے۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے۔ آپ کمرے میں تشریف کیوں نہیں لائے۔ فرمایا مجھے جلد واپس جانا ہے۔ صبح کا نکلا ہوا ہوں۔ ایک سانحہ ہو گیا۔ تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا حکم کیجیے۔ فرمایا، بات یہ ہے کہ فلاں ادارے کے مسوّدوں کا پلندہ لے کر گھر سے نکلا تھا۔ پلندہ سائیکل کے کیریئر پر بندھا تھا۔ راہ میں خدا جانے کہاں گر گیا۔ اگر آج دو مضمون ان کو دے دیتا تو پچیس روپے مل جاتے مگر اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔ کل عید ہے۔ بچوں سے کہہ آیا ہوں جلد آؤں گا اور مٹھائی لاؤں گا۔ کل عیدی بھی دینا ہے۔ پچیس تو نہیں اگر تم پندرہ کا انتظام کر دو تو کام چل جائے گا۔ حفیظ اگلے مہینے آئے اور روپے واپس کر گئے۔''(۲۱)

فکرِ معاش کی گونا گوں مصروفیات کے ساتھ ساتھ فکرِ سخن بھی زوروں پر تھی۔ حفیظ اُردو نظم نگاری میں نئے تجربات کر رہے تھے۔ بہت سے مختلف اثرات کے سوتے مختلف سمتوں سے آ کر حفیظ کی شاعرانہ فطرت میں گھل مل گئے تھے۔ اُن کی تخلیقی آنچ انھیں شاعری کے نئے نئے سانچوں میں ڈھال رہی تھی۔ موسیقی تو بچپن ہی سے جب وہ چھوٹی سی عمر میں میلاد شریف کی گھریلو محفلوں میں نعت اور سلام کے اشعار گا کر سنایا کرتے تھے، ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ پھر ہولی اور بسنت کے

تہواروں میں گائے جانے والے گیت بھجن بھی اس فطری خمیر میں شامل تھے۔اللہ تعالیٰ نے ایسی مترنم آواز عطا کی تھی جو جادو کا اثر رکھتی تھی۔شاید ایسی ہی آواز کے بارے میں مومنؔ نے کہا تھا۔

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

حفیظ اپنے فطری آہنگ اور موسیقی کی لہروں کے زور پر ہی شعر کہتے تھے۔انھیں عروض سے واقفیت نہ تھی۔شعر کہتے وقت وہ اپنے حال میں مست گنگنایا کرتے اور اشعار اسی گنگناہٹ کی لہروں پر تیرتے ہوئے آ ٹپکتے۔کشمیر کی سیر وسیاحت نے انھیں فطری مناظر کے ناقابلِ فراموش حسن و جمال سے آشنا کر دیا تھا۔اور شاعری کے بارے میں مشہور انگریزی شاعر ورڈز ورتھ کے قول کے مطابق اس حسن و جمال کے نقوش ان کے لاشعور کی لوح پر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے تھے۔ جو عمر بھر شعر کے روپ میں ان کی زبان معجز بیان سے ادا ہوتے رہے۔لاہور میں پروفیسر پطرس بخاری اور مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی صحبت نے حفیظ کو شاعری کے نئے ذائقوں اور آرٹ کے نئے زاویوں سے آشنا کیا۔پھر اپنے استاد محترم مولانا گرامی کا قول زریں بھی حفیظ نے حرزِ جان بنا رکھا تھا کہ تقلید کو چھوڑ و اپنی ذات کو باہر لاؤ۔ان تمام اثرات کا نتیجہ ان نظموں کی صورت میں ظاہر ہوا جو حفیظ کے اولین مجموعے نغمہ زار میں شامل ہیں۔نغمہ زار ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔اس کی اشاعت سے پہلے ہی حفیظ کے گیت اور نظمیں لاہور میں زبانِ زد خاص و عام ہو چکی تھیں۔

نغمہ زار کی شاعری کے بارے میں خود حفیظ لکھتے ہیں:

''سوگوار منمناتی اور بسورتی ہوئی بے ثبات فرسودگی کی بجائے میں نے شگفتگی کو اپنا فن بنانے کی ٹھانی...... میں نے اپنے دل سے پوچھا کیا مشاعرے پر محض پرانی غزل سے چھا جانا کافی ہے؟ دل نے کہا ہرگز نہیں۔اب تو سخن فہموں میں باریاب ہو گیا ہوں کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے۔گرامی کی تلقین یاد آئی ''تقلید نہ کر اپنی ذات کو باہر نکال''...... میں نے قلب و نگاہ و زبان کو رنگا رنگ نغمگی سے ہم آہنگ

کرنے کے لیے (طفلانہ ہی سہی) جو نئے نئے تجربے کیے وہ زبان زدعام ہو رہے تھے۔ جوان ہی نہیں بوڑھے بھی ان کو الاپتے اور نئے لکھنے والے ہی نہیں روایت پرست استاد شاعر بھی اپنی طبع کو ان نئے پیمانوں سے ناپنے لگے۔ ہر رہگزر میں مجھ پر انگلیاں اُٹھیں۔ بازاروں میں میرے دائیں بائیں سے ''ابھی تو میں جوان ہوں''، ''پیے جا''، ''دیکھتا چلا گیا'' کے آوازے سنائی دیے۔ ان نظموں کی پیروڈیاں بھی ہوئیں اور تتبع بھی کیا گیا۔ لاہور ان دنوں واقعی شہرِ شعر وسخن تھا۔ آج کون اندازہ کر سکتا ہے کہ سامعین اور شعرا پر میری اس اپج نے کیسے متضاد اثرات وارد کیے۔ سامعین میرے شعر اور ترانے گنگناتے اور اساتذہ خاص الخاص ٹکسالی زبان میں ملاحیاں سناتے ہوئے نکلتے اور پھر اسی طرح کہنے کی کوشش بھی فرماتے......

میری نظم ''فرصت کی تلاش'' انہی دنوں کی ہے۔ مہر صاحب نے ''زمیندار'' کے پہلے صفحے پر شائع کر دی۔ اہلِ زبان نے بے تکی نظم کا عنوان عطا کیا اور اس کی پیروڈیاں لکھیں۔ لاہور میں پھبتیاں کسی جانے لگیں۔ ایک دن علامہ اقبال کے حضور بیٹھا تھا کہ حضرت لکھنؤ کے اودھ پنچ میں میری نظم اور اس کی پیروڈی پڑھ کر ہنسے اور فرمایا۔ جینیئس پر بے تکے پن کے آوازے کسے جاتے رہے ہیں۔ مجھے اس لفظ جینیئس کے معنی معلوم نہ تھے تاہم جی خوش ہوا کہ حضرت فرماتے ہیں تو کوئی اچھی بات ہوگی۔''(۲۲)

شاعری میں جدت اور نئے زاویۂ نظر کی ضرورت پر ن م راشد کے اس قول کے عین مطابق حفیظ کی اس دور کی شاعری بالکل ایک نئی آواز تھی:

''وہ جسمانی یا ذہنی حجرہ نشینی جس میں قدیم شاعر دوسروں کے عشقیہ تجربات کے سہارے شعر گنگنا سکتا تھا آج مضحکہ خیز ہو چکی ہے۔ آج

کے شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھے، اپنے کانوں سے سُنے اور اپنے دل سے محسوس کرے۔''

علامہ تاجور نجیب آبادی اور اس کے شاگردوں کا جتھا اپنے استاد کے اس طرح کے اُوٹ پٹانگ شعروں کو ہی مشعلِ راہ سمجھے ہوئے تھا۔ شعر ذرا ملاحظہ ہوں:

کہاں ہے تو وعدۂ وفا کرکے او مرے بھول جانے والے
مجھے بچا لے کہ پائمال قیامتِ انتظار ہوں میں
کھٹک رہا ہوں ہر اک کی نظروں میں، بچ کے چلتی ہے مجھ سے دنیا
زہے گراں باریٔ محبت کہ دوشِ ہستی پہ بار ہوں میں

....

یہ لٹی ہوئی سی بہار کیوں ہے کہاں وہ جانِ بہار ہے
یہ چمن سے کون چلا گیا کہ کلی کلی کو فشار ہے

....

یہ انیسِ غم کدۂ قفس، ہے عزیزِ جاں مجھے ہم نفس
دلِ داغدار، غم بہار میں یادگارِ بہار ہے

....

یہ حجرہ نشین غزل گو بھلا اس تازہ ہوا اور اس نئی روشنی کی تاب کہاں لا سکتے تھے جو حفیظ کی نظموں اور گیتوں سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ کھسیانے ہو کر اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آئے۔ بڑھ چڑھ کر پراپیگنڈہ کرنے لگے کہ حفیظ کی ساری مقبولیت اور شہرت اس کی آواز کی وجہ سے ہے۔ وہ شاعر نہیں گویّا ہے۔ حفیظ کو زچ کرنے کے لیے یہ لوگ ایک مشاعرے میں طبلے اور ہارمونیم لے آئے اور موسیقی کے یہ آلات سٹیج پر سجا دیے اور اعلان کر دیا کہ سازندے موجود ہیں گائیکی میں اپنا کلام پڑھنے والے سازندوں کو اپنی سنگت کے لیے بلا سکتے ہیں۔ حفیظ نے جب یہ حال دیکھا تو چپکے

سے مشاعرے سے اُٹھ کر چل دیے۔

حریفانِ رُوسیاہ کی دھاچوکڑی کے باوجود حفیظ کی شہرت اور مقبولیت روز افزوں تھی۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں ہزاروں کے مجمع کے سامنے جب حفیظ نے اپنا نعتیہ کلام سنایا تو ایک طلسم باندھ دیا۔ ہر کوئی حفیظ کا گرویدہ ہو گیا۔ لوگ حفیظ کے مجموعۂ کلام کا تقاضا کرنے لگے۔ بزمِ خاصانِ ادب کے اراکین بالخصوص پروفیسر احمد شاہ بخاری اور ان کے چھوٹے بھائی ذوالفقار علی بخاری نے بھی حفیظ کو مجموعہ کلام چھپوانے کی ترغیب دی۔ حفیظ نے مجموعہ مرتب کیا۔ مجموعے کا نام نغمہ زار تجویز ہوا۔ کتابت شروع ہو گئی۔ طباعت کا سارا خرچہ ڈھائی سو روپے کے لگ بھگ بنتا تھا مگر حفیظ کے پاس اتنی رقم کہاں تھی۔ ابھی اسی ادھیڑ بُن کا عالم تھا کہ ریاست خیر پور کے دربار کا ایک نمائندہ حفیظ سے ملا اور تین سو روپے ماہانہ مشاہرے پر نواب خیر پور کا درباری شاعر بننے کی پیش کش کی۔ ۱۹۲۵ء میں تین سو روپے ایک بڑی رقم تھی۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۶ء میں کہیں آ کر کلاس ون افسر کی ابتدائی تنخواہ -/۳۵۰ روپے تک پہنچی۔ مالی پریشانیوں میں اُلجھے ہوئے حفیظ کے لیے یہ پیش کش گویا جنت میں داخلے کی نوید تھی۔ حفیظ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خیر پور جا پہنچے۔ نغمہ زار کی کتابت دھری کی دھری رہ گئی۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں حفیظ وہاں کی صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو گئے۔ درباداری کی جعلی زندگی ان کی آزادانہ اور شاعرانہ طبیعت کے منافی تھی۔ پھر ایک طرف فاقہ زدہ عوام کی غربت اور بے بسی اور دوسری طرف نواب اور اس کے اقرباء کی عیش وعشرت ان کے لیے سوہانِ روح بنتی جا رہی تھی۔ وہ تو مبدائے فیض سے ایک باغیانہ طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اس فرسودہ روایتی ماحول میں ان کا دم گھٹنے لگا۔ ان کے احساس و وجدان کی یہی کیفیت تھی اور ابھی حفیظ کو خیر پور میں صرف تین مہینے ہوئے تھے کہ ایک دن نواب صاحب کی منظورِ نظر رقاصہ نے اپنی شان میں ایک قصیدہ لکھنے کی فرمائش کر دی۔ نواب نے بھی اپنی دل پسند حسینہ کی فرمائش پر حفیظ کو حکم دیا کہ اس کے حسن و جمال اور رقص و رعنائی کی تعریف میں نظم لکھے اور برسرِ دربار اپنے مخصوص ترنم میں سنائے۔ حفیظ نے اس فرمائش پر

جو نظم لکھی اس میں تعریف و توصیف کی بجائے تضحیک اور توہین بلکہ لعنت ملامت کا اظہار کیا۔ نظم سنتے ہی اس محترمہ کی حالت غیر ہوگئی۔ نواب آگ بگولہ ہوگیا۔ اس نے حکم صادر کیا کہ حفیظ کو پکڑ کر زندان میں ڈال دیا جائے۔ بندی خانے میں ابھی تین دن ہی گزرے تھے کہ حفیظ کو وہاں سے نکال کر ریاست کی حدود سے باہر پھینک دیا گیا۔ اس نظم کے کچھ بند ملاحظہ ہوں:

ہاں ناچتی جا گائے جا　　　نظروں سے دل برمائے جا
تڑپائے جا تڑپائے جا
او دشمن دنیا و دیں
تیرا تھرکنا خوب ہے　　　تیری ادائیں دل نشیں
لیکن ٹھہر تو کون ہے　　　او نیم عریاں نازنیں
کیا مشرقی عورت ہے　　　ہر گز نہیں ہر گز نہیں
تیری ہنسی بے باک ہے
تیری نظر چالاک ہے
شرم اور عزت والیاں　　　ہوتی ہیں عصمت والیاں
وہ حسن کی شہزادیاں　　　پردے کی ہیں آبادیاں
چشم فلک نے آج تلک　　　دیکھی نہیں ان کی جھلک
سرمایۂ شرم و حیا　　　زیور ہے ان کے حسن کا
شوہر کے دُکھ سہتی ہیں وہ　　　منہ سے نہیں کہتی ہیں وہ
کب سامنے آتی ہیں وہ　　　غیرت سے کٹ جاتی ہیں وہ
اعزازِ ملت ان سے ہے　　　نام شرافت ان سے ہے
سچ سچ بتا تُو کون ہے
او بے حیا تُو کون ہے

خیر پور ریاست میں یوں تین ماہ کا مختصر عرصہ اپنی نظم رقاصہ کی تخلیق سے امر بنانے کے بعد حفیظ سندھ سے پنجاب واپس پہنچے اور سیدھے جالندھر گئے۔ ان کی والدہ انتقال کر چکی تھیں۔ ماں کی قبر پر حاضری دی۔ چار آنسو بہائے۔ والدہ سے جدائی اور اپنی تنہائی کے دُکھ کا احساس دامن گیر ہوا، اب تک کی زندگی اور آوارگی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے آ آ کر مختلف مناظر دکھاتی رہی۔ پہلی دفعہ اپنا جائزہ لیا۔ کون ہوں، کیا ہوں، آگے کیا کرنا ہے۔ ان سوالات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اپنے آپ کو ٹٹولا۔ زندگی کا مقصد اور اپنی منزل کے بارے میں سوچ بچار پیدا ہوئی۔ چاروں طرف گہری دھند کے سائے نظر آئے۔ حفیظ نے اس کیفیت کا حال یوں لکھا ہے:

> ''والدہ کی موت اور میرا آخری وقت موجود نہ ہونا میرے لیے احساس کا ایک نیا رُخ پیدا کر رہا تھا۔ مجھے کہاں سے کہاں پہنچا رہا تھا۔ فرزندوں میں دو جوانا مرگ ہو چکے تھے۔ ایک میں ہی اکیلا اس مامتا کا سہارا تھا۔ نکما، نا کارہ کہ اس کے بستر مرگ کے قریب بھی نہ رہ سکا۔ وہ عزت والوں کی بیٹی اور بہو تھی۔ اس کے پاس زیور اور روپیہ بھی تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں کوئی کام کاج کروں۔ بَس جاؤں۔ اس کی تمنا تھی میرا بیٹا کماؤ بن جائے، سر بلند نظر آئے۔ میری بیوی نے مجھے زیور اور روپیہ سے بھرا ہوا صندوقچہ دکھایا جو وہ مرنے والی میرے لیے اس کے سپرد کر گئی تھی۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ یہ ترکہ اب میرے کسی کام کا نہ تھا۔ میں نے اسے ترک کیا۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح پھر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اپنی بیوی، بچیوں اور بیوہ بہن کو بوڑھے اور شکستہ دل والد کی نگرانی میں جالندھر چھوڑا اور ایک مبہم سا نیا احساس سینے میں چھپائے ہوئے لاہور پہنچا۔''(۲۳)

حفیظ کے لاہور پہنچنے سے پہلے ہی اس کی نظم ''رقاصہ'' کی شہرت اور شانِ نزول کے تذکرے لاہور پہنچ چکے تھے۔ لوگوں نے حفیظ کی زبان سے یہ سب کچھ سُننے کے لیے محفلیں برپا

کیں۔ نظم سارے شہر میں مشہور ہوگئی۔ لوگوں کو ازبر ہوگئی۔ کسی نے شائع کر دی ہر گلی کوچے میں جا پہنچی۔

اب لاہور میں حفیظ نے اپنی رہائش کا یہ بندوبست کیا کہ ایک بڑا سا مکان کرایہ پر لیا اور اس کے کمرے اسلامیہ کالج کے طالب علموں کو جنھیں ہاسٹل میں جگہ نہیں مل سکی تھی اور وہ اجنبی شہر میں کسی نہ کسی ٹھکانے کی تلاش میں تھے کرایے پر دے دیے۔ اپنے پاس باہر کا ایک برآمدہ اور ایک کمرہ رکھا۔ اس مکان کا نام احباب نے ''سدابہار'' تجویز کیا اور باقاعدہ اس کے دروازے پر Ever Green کے الفاظ لکھ دیے گئے۔

۱۹۲۵ء کے یہی شب و روز تھے جب نغمہ زار طلوع ہوا۔ اُردو شاعری کے شائقین اس مجموعہ کے منتظر تھے اور حفیظ سے اس کی اشاعت کا تقاضا کر رہے تھے۔ یہ مجموعہ دہلی، لکھنؤ، الٰہ آباد بلکہ حیدر آباد تک جا پہنچا۔ طرح طرح کے تبصرے ہونے لگے۔ تعریف بھی اور تنقیص بھی۔ کسی نے اُسے اُردو شاعری میں تازہ ہوا کا ایک جھونکا قرار دیا۔ کسی نے حفیظ کی نظموں اور گیتوں کو شاعری ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ مگر ہر ادبی محاذ پر تذکرے اسی کتاب کے ہو رہے تھے۔ ماہنامہ ''نیرنگِ خیال'' لاہور میں ڈاکٹر تاثیر نے نغمہ زار پر ایک مضمون لکھا اور حفیظ کی جدت طرازی اور نغمگی کی دل کھول کر تعریف کی۔ ڈاکٹر تاثیر سے ابھی تک حفیظ کی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ امرتسر ایم اے او کالج میں استاد تھے۔

انہی دنوں مکہ پر چڑھائی ہوئی۔ بیت اللہ میں پناہ لینے والے نہتے لوگوں پر گولیاں برسائی گئیں۔ کعبے کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کے جذبات کو سخت ٹھیس لگی۔ برصغیر کے طول و عرض میں مظاہرے ہونے لگے۔ ہر شہر ہر قصبے میں جلسے جلوسوں کا اہتمام کیا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر کی سرکردگی میں مسلمانوں کا ایک وفد حجاز جانے کے لیے عازم سفر ہوا۔ مولانا غلام رسول مہر اس وفد کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ان کی روانگی پر ایک پُرہجوم الوداعی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں حفیظ نے اپنے مخصوص دل میں اتر جانے والے ترنم میں اپنی تازہ نظم پڑھی۔ ''میرا اسلام لے جا''۔ یہ نظم آناً فاناً سارے لاہور میں پھیل گئی۔ ہندوستان کے ہر شہر تک جا پہنچی۔

امراؤ ضیاء بیگم نے گائی۔ اس کا ریکارڈ بنا، جو گھر گھر سنا جانے لگا۔ حفیظ کی اس نظم نے مسلمانوں کے زخم خوردہ دل پر مرہم رکھا اور ان کے دلی جذبات کو زبان دی۔

میرا سلام لے جا

قسمت کے آسماں پر سیمائے کہکشاں پر

چمکا ترا ستارہ

اس دَر پہ حاضری کا تجھ کو ہوا اشارہ

اے بختیار بندے

اے کامگار بندے

تیری مراد مندی تقدیر کی بلندی

تجھ کو پکارتی ہے

آ باریاب ہو جا

اے ذرۂ محبت جا آفتاب ہو جا

دربار میں چلا ہے

سرکار میں چلا ہے

رختِ سفر اُٹھا لے اللہ کے حوالے

یثرب کے جانے والے

بس اک پیام لے جا

میرا سلام لے جا

گمانِ غالب ہے کہ اس نظم کی بے پناہ شہرت و مقبولیت نے حفیظ کو نغمہ زار کی نظموں کے برعکس دینی اور اسلامی موضوعات پر نظم گوئی کی طرف راغب کیا۔ کئی دوسرے عوامل کے علاوہ اس نظم کا بھی شاہنامہ اسلام کی تصنیف کی تحریک میں کچھ حصہ ضرور ہے۔

اگست ۱۹۲۵ء میں ایک تاریخی اور یادگار آل انڈیا مشاعرہ شملے میں منعقد ہوا۔ شیخ سرعبدالقادر اس وقت پنجاب کے وزیرتعلیم تھے اور گرمائی ہیڈکوارٹر شملے میں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے حفیظ کو بطور خاص اس مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی۔ ان کے علاوہ مشاعرے کے منتظمین کی طرف سے علامہ تاجور نجیب آبادی کو مع ان کے شاگردوں کے جتھے کے شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس میں یہ ہدایت بھی درج تھی کہ اپنے ساتھ حفیظ جالندھری کو بھی ضرور لانا ہے۔ تاجور نجیب آبادی بادلِ ناخواستہ دعوت نامہ لے کر حفیظ سے ملنے ان کی رہائش گاہ سدابہار پہنچے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ تاجور نے حفیظ کے ہاں تشریف لانے کی ضرورت محسوس کی اور روانگی کے پروگرام سے آگاہ کیا۔ شاعروں کا یہ قافلہ بذریعہ ٹرین عازم سفر ہوا۔ راستے میں علامہ تاجور نجیب آبادی نے یہ اہتمام کیا کہ اپنے شاگردوں کے ذریعے حفیظ کو سیندور ملے پان کھلوائے تاکہ ان کا گلا بیٹھ جائے اور وہ مشاعرے میں اپنی آواز کا جادو نہ جگا سکیں۔

یہ مشاعرہ اس لحاظ سے بھی ایک یادگار مشاعرہ تھا کہ اس کے سامعین میں مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، پنڈت مدن موہن مالویہ، سرسپرو، راجہ نیر بندرناتھ، سرسید احمد خان کے پوتے سرراس مسعود، سرضیاء الدین اور کئی دوسرے مشاہیر موجود تھے۔ مشاعرے کی صدارت ہز ہائی نس نواب امیرالدین احمد خان والی ریاست لوہارو نے کی۔ شملہ پہنچتے ہی حفیظ شیخ سرعبدالقادر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے فوراً محسوس کیا کہ حفیظ کی آواز بیٹھی ہوئی ہے اور گلے میں کوئی خرابی ہے۔ اسی وقت حفیظ کو اپنے پرنسپل سیکرٹری کے ہمراہ شملے کے ایک معروف حکیم حاذق کے پاس بھیجا۔ اس نے گلے کا معائنہ کرنے کے بعد کہا "یہ تو سیندور کھا گیا ہے" کچھ گولیاں دیں جو وقفے وقفے سے کھانی تھیں۔ ان گولیوں سے حفیظ کی آواز آہستہ آہستہ بحال ہونے لگی۔

اگلے دن مشاعرہ گاہ پہنچے تو تاجور نجیب آبادی نے اپنے جتھے کو لے کر گویا سٹیج پر قبضہ کر لیا حفیظ اور اس کے ساتھ گئے ہوئے دوستوں کو نیچے سامعین کی نشستوں پر جگہ دلوائی۔ حفیظ ابھی کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ عقب سے ایک صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی طرف

متوجہ کیا۔ یہ ڈاکٹر تاثیر تھے اور حفیظ سے ان کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے ڈاکٹر تاثیر حفیظ کے مجموعے نغمہ زار پر ''نیرنگِ خیال'' میں ایک سیر حاصل اور تعریف و توصیف سے بھرپور تبصرہ کر چکے تھے۔ حفیظ کا دل اپنے ایک نامور مداح سے مل کر باغ باغ ہو گیا۔ اس اچانک ملاقات کا حال حفیظ نے یوں بیان کیا ہے:

> ''ابھی مشاعرہ شروع نہ ہوا تھا کہ میرے عقب سے کسی نے میرے کندھے کو بھاری ہاتھ سے دبایا۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک نوجوان، شایانِ جوانی، سادہ رُو، کشادہ پیشانی، ترکی ٹوپی، سفید قمیص، نکٹائی اور شملے کوٹ کے ساتھ شلوار پہنے مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے اس کو پہلے نہ دیکھا تھا۔ میری نگاہ میں استفسار کی جھلک پاتے ہی جھک کر اس نے میرے کان میں کہا ''میں تاثیر ہوں'' ساتھ ہی ایک خالی کرسی کھینچ کر میرے اور پنڈت ہری چند اختر کے درمیان ڈٹ گیا۔''(۲۳)

حفیظ نے اپنی باری آنے پر پہلے تو سامعین سے اپنی آواز کی خرابی پر معذرت کی اور یہ بھی کہا کہ بعض لوگوں کے نزدیک میری شاعری میرا گلا ہی ہے اور اس وقت گلا بیٹھا ہوا ہے مگر پھر جو حفیظ نے ترنم سے اپنی غزل کا آغاز کیا تو قدرت خدا کی، گلا کھل گیا۔ سامعین نے ہر شعر پر بڑھ چڑھ کر داد دی۔

مجھ کو ان مجبوریوں پر بھی ہے اتنا اختیار
آہ بھر لیتا ہوں میں، فریاد کر لیتا ہوں میں

حسن بے چارہ تو ہو جاتا ہے اکثر مہرباں
پھر اُسے آمادۂ بیداد کر لیتا ہوں میں

ہاں یہ ویرانہ یہ دل یہ آرزوؤں کا مزار
تم کہو تو پھر اسے آباد کر لیتا ہوں میں

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظؔ
ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

غزل کے بعد حفیظ سے فرمائشیں شروع ہوگئیں۔ابھی تو میں جوان ہوں، بسنت، چاند کی سیر، برسات، فرصت کی تلاش کتنی ہی نظمیں حفیظ نے سامعین کے پُر زور اصرار پر سُنا ڈالیں۔ سماں بندھ گیا۔حفیظ کا جادو سر چڑھ کر بولا۔مشاعرہ دن کے دو بجے شروع ہوا تھا رات کے ساڑھے آٹھ بجے ختم ہوا۔اختتامی تقریر کے لیے خواجہ حسن نظامی کو دعوت دی گئی۔خواجہ صاحب نے حفیظ جالندھری کو ہندوستان گیر شہرت کا دولہا قرار دیا۔

جناب محمد طفیل مدیر ''نقوش'' کے بیان کے مطابق خواجہ حسن نظامی نے ایک فقرہ چلا دیا ''رات تو حفیظ کا نکاح ہوگیا۔''

''کس سے؟ شہرت کے ساتھ''

یہ فقرہ بہت چلا کہ حفیظ کا نکاح ہوگیا۔کئی لوگوں کو اصل واقعہ کا علم نہ تھا۔استفسار حفیظ صاحب سے بھی ہونے لگا۔

''سنا ہے آپ نے نکاح کرلیا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کس سے''

''یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں مگر نکاح خواجہ حسن نظامی نے پڑھوایا تھا۔''

اب حفیظ کو اپنے کلام کی تاثیر کے جادو سے پوری طرح خود آگاہی ہو چکی تھی۔ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی اس نعمت یعنی اس جادو سے کوئی اہم اور غیر معمولی کام لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔اپنے استاد محترم حضرت مولانا عبدالقادر گرامی کا یہ قول فیصل انھوں نے اپنے پلے باندھ رکھا تھا کہ ''تقلید نہ کرو۔اپنی ذات کو باہر لاؤ۔'' ان کی ذات کا اظہار تو فطری طور پر سات سال کی عمر میں ہو چکا تھا جب ان کی زبانِ معجز بیاں سے بے ساختہ یہ پہلا شعر نکلا تھا:

محمدؐ کی کشتی میں ہوں گا سوار
تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار

انھوں نے محض روایتی غزل گوئی اور گیت نگاری کے میدان کو اپنے لیے ناکافی سمجھا؟ نہ ہی اسے اپنی زندگی کا مقصدِ وحید بنانے کا ارادہ ان کے دل میں تھا۔ انھیں اپنے رہوارِ قلم کے لیے کسی نئی جولاں گاہ کی تلاش تھی۔

''کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے'' کے مصداق وہ کوئی منفرد اور انوکھا کارنامہ سرانجام دینا چاہتے تھے۔ قومی اور ملی نوعیت کا کوئی کارنامہ۔

گل و بلبل اور زلف و رخسار کی تعریف و توصیف کا پٹا ہوا راستہ انھیں مرغوب نہ تھا۔ ان کا دل قوم کی زبوں حالی پر کڑھتا تھا۔ دل میں دینِ اسلام کی خدمت کا جذبہ اور مسلمانوں کے لیے درد موجزن تھا۔ وہ اقبال اور حالی کی طرح مسلمانانِ ہند کو بیدار کرنے اور انھیں ملی اور قومی جدوجہد کے لیے تیار کرنے کا عزم اپنے دل میں رکھتے تھے۔ خود انھوں نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمتِ اسلام کر جاؤں

انھوں نے اپنے جذبے اور عزم کا اظہار شیخ سر عبدالقادر اور حضرت علامہ اقبال سے کیا۔ دونوں نے حفیظ کے اس جذبے کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ حضرت علامہ نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ شبلی نعمانی کی طرح تاریخ اسلام کے مختلف ولولہ انگیز واقعات اور مشاہیر اسلام پر نظمیں لکھیں۔ مگر حفیظ نے محض شبلی نعمانی کی تقلید میں نظمیں لکھنے کو کافی نہ سمجھا۔ آخر انھیں اپنا راستہ نظر آ گیا۔

کیا فردوسیؔ مرحوم نے ایران کو زندہ
خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ

انھوں نے فردوسیؔ کی طرز پر اُردو میں ''شاہ نامہ اسلام'' لکھنے کا آغاز کر دیا اور اس راہ پر

اتنی سرعت سے گامزن ہوئے کہ سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل شاہ نامہ اسلام کی پہلی جلد تیار ہوگئی۔ نہ صرف یہ بلکہ ۱۹۲۸ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر قارئین کے ہاتھوں میں جا پہنچی۔ ان قارئین کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ ''شاہ نامہ اسلام'' چھپنے سے پہلے ہی ملک کے طول و عرض میں مشہور ہی نہیں بلکہ بے حد مقبول ہو چکا تھا۔ حفیظ اس کتاب کے مختلف حصے مشاعروں اور انجمن اسلامیہ لاہور جیسی کئی انجمنوں، جو ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھیں، کے جلسوں میں اپنے مخصوص ترنم سے پڑھ کر سنا چکے تھے اور سامعین کے دل گرما چکے تھے۔

''شاہ نامہ اسلام'' اُردو شاعری کی واحد کتاب ہے جو چھپنے سے پہلے ہی پورے ملک کے طول و عرض میں مشہور و معروف ہو چکی تھی۔ جب حفیظ جالندھری نے اخبار میں اشتہار دیا کہ شاہ نامہ کی پہلی جلد زیرِ طبع ہے۔ شائقین سے التماس ہے کہ وہ اس کی قیمت مبلغ ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر پہلے ہی مصنف کو بھیج کر اپنی کاپی محفوظ کرالیں تو حفیظ صاحب کے نام منی آرڈروں کا نہ ختم ہونے والا ایک تانتا بندھ گیا۔ میرزا محمد منوّر راوی ہیں کہ اس کثیر تعداد میں منی آرڈر آنے لگے کہ جی پی او لاہور کو صرف حفیظ صاحب کے لیے ایک الگ ڈاکیہ مختص کرنا پڑ گیا۔ جسٹس سر عبدالقادر کے ایما پر شاہ نامہ اسلام کی پہلی جلد کی رونمائی کی تقریب ۱۹۲۸ء میں شملہ میں منعقد ہوئی۔ ہندوستان کی کئی اہم شخصیات نے اس تقریب میں شرکت کی۔ کئی نامور شخصیات مثلاً امیر آف بہاول پور اور ہز ہائی نس والی ریاست لوہارو نے شاہ نامہ کا ایک ایک نسخہ ایک ایک ہزار روپے سے خریدا۔ ایک سو روپیہ فی نسخہ ادا کرنے والوں کا تو شمار ہی نہیں تھا۔ دولت حفیظ کے قدموں پر نچھاور ہونے لگی۔ حفیظ صاحب نے ماڈل ٹاؤن لاہور میں چار چار کنال کے دو پلاٹ خرید لیے۔

شاہ نامہ اسلام کے اشعار نے مسلمانوں کے دلوں پر کیا جادو کیا اس کا ایک منظر سید ضمیر جعفری کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''(حفیظ کو) پہلی مرتبہ دُور سے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں دیکھا تھا جو نواں کوٹ لاہور کے یتیم خانے میں منعقد ہوا تھا۔ بہت بڑا اجتماع تھا

جس میں لاہور کے بھی اور باہر سے آئے ہوئے بھی بڑے بڑے لوگ بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ حفیظ پہلی قطار کے قلب میں بڑے لوگوں کی صف میں براجمان تھے اور میں اپنے تین چار ہم سبق طلبا کے ساتھ میمنہ یا میسرہ میں ایستادہ۔ چند تقریروں کے بعد جس میں چندے کی وصولی کا ہر وار خالی چلا گیا تھا سیکرٹری صاحب نے ابوالاثر حفیظ جالندھری کا نام پکارا۔ ہم جہلم کے اسکاؤٹ ہمہ تن چشمِ نگراں بن گئے کہ دیکھیے کس طرف سے کس طرح کا حفیظ نکلتا ہے۔ مگر جب لمبوترے سے چہرے کا ایک دبلا پتلا جوان جس نے بھورے رنگ کی پتلی سی شیروانی کے ساتھ سر پر اونچی دیوار کی لال رومی ٹوپی جما رکھی تھی، دو کتابیں اٹھائے ہوئے کرسی سے اٹھا، تو سچ یہ ہے کہ ہم جہلم کے صورت نا آشنا اسکاؤٹوں پر اوس پڑ گئی۔

''اچھا تو یہ ہیں حفیظ صاحب''

''لو دیکھ لو اپنا حفیظ جالندھری ابوالاثر وغیرہ''

''بھئی یہ تو نہایت مایوس کن ہے''

''کاش یہ حکیم مومن خان مومن والی ٹوپی ہی پہن آتے''

''دور کے ڈھول سہانے''

تاہم جی ہی جی میں ہم سب بہت خوش تھے کہ حفیظ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ تو لیا۔

ادھر حفیظ صاحب کا نام سنتے ہی لوگوں نے زور وشور سے تالیاں بجائیں۔ تحسین ومسرت کے نعرے بھی لگائے۔ ٹہلنے والے دوڑ کر پنڈال میں واپس آ گئے۔ اور پھر یک بارگی ہزاروں انسانوں کے ہجوم پر ایسا گہرا

اور گھمبیر سناٹا طاری ہو گیا کہ اس سے پہلے ہم نے ایسا سناٹا نہ کبھی دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ کرسی والے کرسی اور دری والے دری پر بیٹھے بیٹھے اپنی اپنی گردنیں بڑھا کر یوں ہمہ تن گوش ہو گئے کہ ہمارے کنگز سکاؤٹ جمشید کے بقول اگر اس وقت تھالی پھینکی جاتی تو وہ انسانی سروں کے اوپر پھسلتی ہوئی مزنگ تک جا پہنچتی۔

حفیظ نے شاہ نامہ اسلام سے جنگِ بدر کا پارہ سنانا شروع کیا۔ روح میں بھڑکتی ہوئی آگ تھی جو اس شخص کے شعلۂ آواز سے ٹوٹ ٹوٹ کر قلوب میں سوز و گداز، درد و جذب، عزم و عزیمت اور نور و سُرور کی کیفیت بھر رہی تھی۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت حمزہ کے معرکۂ جہاد کی آنچ سے دھکتی ہوئی منظر کشی پر ہجوم کس طرح تڑپ اٹھا تھا۔ پورا جلسہ جب سمٹ کر حفیظ کی مٹھی میں آ گیا تو یہ حضرت دفعتاً خاموش ہو گئے۔ چاروں طرف ایک خاص فاتحانہ انداز سے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ پھر نظم چھوڑ کر نثر میں انجمن کے لیے مالی امداد کی اپیل کی۔ اپیل سے زیادہ دھمکی تھی کہ جب تک پچاس ہزار روپیہ جمع نہ کر دیا جائے گا میں آگے نہ چلوں گا۔ یہ سُن کر ہمارا کلیجہ دھک سے رہ گیا کہ حفیظ نے ناحق خود کو اور ایک غریب قوم کو آزمائش میں ڈال دیا۔ مگر ہوا یہ کہ چاروں طرف سے سیم و زر کی بارش شروع ہو گئی۔ عورتوں نے زیور اتارا تار کر سٹیج پر ڈھیر کر دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے قوم نے حفیظ کی شرط پوری کر دی۔''

یہ تھی (نصف صدی کے) اس قصے سے میری پہلی شناسائی۔ گزشتہ ربع صدی سے یہ قصہ برابر میرے سامنے ہے بلکہ پچھلے پندرہ سولہ برس سے تو گویا میں خود بھی اس قصے میں شامل ہوں کہ اس پورے دور میں کسی نہ کسی

طرح ان کے قریب رہنے کا اتفاق مجھے ہمیشہ حاصل رہا ہے اور اس طرح حاصل رہا ہے کہ ''ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے۔''(۴۴)

یہ تماشا حفیظ کی اس منفرد صلاحیت اور اس کمال فن کا مظاہرہ ہے جس کے بل بوتے پر انھوں نے برصغیر کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی بے شمار اسلامی اور دینی انجمنوں اور رفاہی اداروں کے لیے چندہ اکٹھا کیا۔ محمد طفیل حفیظ پر اپنی کتاب ''مخدومی'' میں لکھتے ہیں:

''حفیظ صاحب چندہ اکٹھا کرنے میں بڑے ماہر ہیں۔ جتنا چندہ انھوں نے اکٹھا کیا، کم کسی نے کیا ہو گا۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہو تو اکڑ جائیں گے چندہ دو گے تو نظم پڑھوں گا۔ قائداعظم فنڈ پر اڑ جائیں گے۔ پہلے چندہ بعد میں نظم۔ ریڈ کراس کا جلسہ ہو تو اصرار۔ چندہ جمع کیجیے بندہ بھی حاضر ہے۔

قومی کاموں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ شاید پوری دنیا میں اس میدان میں ان کا کوئی مدمقابل نہ ہو۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا ذکر ہے۔ انجمن حمایت اسلام کی ایک شاخ جالندھر میں بھی تھی۔ یہ انجمن کے جلسے میں چندے کی ایک مہم پہ کھڑے ہوئے۔ اپنی نظم سنائی۔ جب لوگ جھوم رہے تھے، داد کے ڈونگرے برسا رہے تھے تو انھوں نے بیچ ہی میں نظم پڑھنے سے انکار کر دیا اور کہا ''پہلے انجمن کو چندہ دیجیے اس کے بعد نظم پڑھوں گا''۔ چنانچہ لوگوں نے چندہ دینا شروع کر دیا۔ جالندھر ان کا اپنا شہر تھا۔ سب کو جانتے تھے۔ چنانچہ حفیظ صاحب نے اب نام لے لے کر چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا مثلاً کہا ''میں خیر دین کی طرف دیکھ رہا ہوں'' جواب میں خیر دین نے کہا ''ایک ہزار روپیہ''۔ پھر انھوں نے سخاوت اللہ کی طرف دیکھ کر کہا ''یہاں

سخاوت اللہ صاحب بھی بیٹھے ہیں'' انھوں نے کہا ''دو ہزار روپے''۔ پھر انھوں نے کہا ''مسلمان چندہ اس لیے دے رہے ہیں کہ یہ ان کا قومی ادارہ ہے مگر میری نظر ایک ہندو سپوت نیکی رام پر بھی ہے۔'' نیکی رام نے کہا ''تین ہزار'' غرض اسی طرح ہزاروں ہزار روپیہ اکٹھا کر لیتے۔

جن دنوں ترکی میں زلزلہ آیا تھا ان دنوں بنگال کے وزیراعظم شیر بنگال فضل الحق تھے۔ ترکی کی امداد کے لیے مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔ ہندوستان کے سب شاعر پہنچے۔ سرکاری طور پر چندہ اکٹھا ہوا۔ مشاعرے کے ذریعے بھی رقم اکٹھی کرنا تھی۔ مشاعرے کی صدارت وزیراعظم جناب اے کے فضل الحق ہی کر رہے تھے۔ جب حفیظ صاحب کو نظم پڑھنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے سٹیج پر آ کے حاضرین سے کہا ''میں اس وقت تک نظم نہ پڑھوں گا جب تک پچاس ہزار روپے اکٹھے نہ ہو جائیں۔''

''نظم پڑھیے......نظم پڑھیے''

''پہلے چندہ دیجیے۔ پورے پچاس ہزار''

وزیراعظم نے حفیظ صاحب سے کہا ''یہ رقم زیادہ ہے اس پر اصرار نہ کیجیے۔ جو کچھ مل جائے وہی ٹھیک ہے۔''

حفیظ صاحب نے لاؤڈ اسپیکر پر حاضرین کو بتایا کہ وزیراعظم صاحب فرما رہے ہیں کہ رقم زیادہ ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ میں اس وقت تک نظم نہ پڑھوں گا جب تک کہ مطلوبہ رقم پوری نہ ہو جائے۔''

حیدرآباد دکن سے کمال یار جنگ بھی آئے ہوئے تھے انھوں نے خاصی رقم دی۔ پنجابی سوداگران نے بھی دل کھول کر چندہ دیا۔ اُدھر لوگوں کا شور بڑھ رہا تھا ''نظم پڑھیے۔ نظم پڑھیے''

وزیراعظم نے پھر کہا ''حفیظ صاحب! نظم پڑھیے۔ رقم کم بھی ہوئی تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن لوگوں کے اشتیاق میں مزید رخنہ نہ ڈالیں۔''

حفیظ صاحب نے فضل الحق صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہا ''آپ بنگال کے شیر ہیں اور ایک پنجابی گیدڑ کو سرنڈر پر مجبور کر رہے ہیں۔ مگر میں ایسا نہ کروں گا اور اس وقت تک نظم نہ پڑھوں گا جب تک کہ واقعی پچاس ہزار کی رقم مل نہیں جاتی۔''

جب منتظمین نے یہ بتایا کہ رقم پچاس ہزار سے بھی زیادہ ہو گئی ہے تو اس کے بعد حفیظ صاحب نے نظم پڑھی۔

محمد طفیل مزید رقمطراز ہیں:

''جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ قومی کاموں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے سلسلے میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ شاید پوری دنیا میں کوئی مدمقابل نہ ہو۔''

رفاہی کاموں میں حفیظ صاحب کی یہ غیر معمولی اعانت تاریخ ادب کا ایک ناقابل فراموش باب ہے اور یہ مقام اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ انسان سے سچی محبت اور مذہب سے والہانہ عشق نہ ہو۔ اس طور سے قوم نے اگر کسی کو نوازا ہے تو وہ صرف چند ہستیاں ہیں۔ سرسید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری۔

نواب بہاول پور شاہ نامے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے حفیظ کو عیدین پر باقاعدہ دربار میں حاضری کے لیے دعوت نامہ جاری کر دیا اور ہر دفعہ بیش قیمت نقد انعامات سے نوازا۔ ۱۹۳۵ء میں نواب صاحب حفیظ کو اپنے ساتھ حج پر لے گئے۔ نظام حیدرآباد دکن نے مبلغ تین سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو تین سال تک ملتا رہا۔ ۱۹۳۸ء میں جسٹس شیخ سر عبدالقادر حفیظ صاحب کو اپنے ہمراہ انگلستان لے گئے۔ چند دن فرانس میں بھی گزارے۔ تقریباً آٹھ ماہ انگلستان، زیادہ تر لندن، میں رہے۔ ان کے اعزاز میں وہاں مقیم ہندوستانیوں نے کئی تقریبات

منعقد کیں۔ حفیظ صاحب کے کلام کو بے حد سراہا گیا اور انھیں بے پناہ داد ملی۔ ان تقریبات کی خبریں لندن کے اخبارات نے حفیظ صاحب کی تصاویر کے ساتھ نمایاں طور پر شائع کیں۔ جنھیں پڑھ کر وہ انگریز خاتون جسے شیخ سر عبدالقادر نے حفیظ کو انگریزی بول چال سکھانے پر مامور کیا تھا حفیظ کی شاعری سے اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے اپنے طور پر "Poet Son of India" کے نام سے ایک کتاب حفیظ پر لکھ ڈالی۔ کسی انگریز خاتون کے قلم سے اُردو زبان کے کسی شاعر پر لکھی یہ پہلی انگریزی تصنیف ہے۔

جب حفیظ لندن سے لاہور واپس آئے تو یہ خاتون اپنی کتاب کا مسودہ لے کر حفیظ صاحب کے پیچھے پیچھے لاہور آ پہنچی اور حفیظ صاحب کی ایسی گرویدہ ہوئی کہ اس کے شوق کی تسکین کے لیے حفیظ کو اس سے شادی کرنا پڑی۔ اس خاتون کا نام انیلا تھا۔ روایت ہے کہ یہ شادی حفیظ صاحب کی پہلی بیوی زینب کے ایماء پر ہوئی۔ زینب سے حفیظ کی آٹھ بیٹیاں تھیں۔ اولادِ نرینہ کی خواہش میں خود زینب نے حفیظ کی شادی انیلا سے کرائی۔ مگر انیلا سے بھی ایک بیٹی ہوئی۔ انیلا ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۲ء تک حفیظ صاحب کے نکاح میں رہی۔ ۱۹۵۲ء میں طلاق لے کر لندن چلی گئی۔ اس کی ہمت قابلِ داد ہے کہ حفیظ صاحب کے ساتھ تقریباً ۱۳ سال کا طویل عرصہ گزار دیا جیسا کہ آگے ذکر آئے گا حفیظ صاحب کے ساتھ دن رات اکٹھے رہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

حفیظ صاحب کے دورۂ انگلستان کا حاصل صرف انیلا ہی نہ تھی بلکہ انھوں نے وہاں دو اہم نظمیں بھی لکھیں جنھوں نے ان کے سرمایۂ شعر وسخن میں قابل قدر اور قابل ذکر اضافہ کیا۔ ایک نظم کا عنوان ہے ''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے''۔ اس نظم میں انھوں نے اپنے ان ہم وطنوں کو جو انگلستان میں آ کر بس گئے تھے اور انگریزوں کی تہذیب وتمدن پر فریفتہ تھے بڑے انوکھے اور دلکش انداز سے اپنے وطن کی یاد دلائی۔ دوسری نظم میں انھوں نے انگلستان کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیے۔ اس نظم کا عنوان ہے ''افرنگ کی دنیا''۔ دونوں نظمیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ افرنگ کی دنیا میں تو حفیظ نے انگریزوں کو آئینہ دکھایا ہے۔

جنگ عظیم دوم کے دوران سر اکبر حیدری گورنمنٹ آف انڈیا میں وزیر تھے۔ انھوں نے ہندو کانگریس کی پالیسی کے توڑ کے لیے حفیظ صاحب کو جنگ میں انگریزوں کی مدد کے لیے آمادہ کیا۔ سر فیروز خان نون جو اس وقت وزیر دفاع تھے ان سے حفیظ صاحب کے لیے سانگ پبلسٹی کا ایک نیا محکمہ بنوایا۔ حفیظ پہلے اس محکمے کے آرگنائزر، پھر ڈائریکٹر اور آخر میں ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ انھوں نے پورے پانچ سال تک اس محکمے کو نہایت کامیابی سے چلایا۔ آغاز میں ان کی تنخواہ سات سو روپے ماہانہ مقرر ہوئی جب ڈائریکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچے تو اس وقت ان کی ماہانہ تنخواہ اکیس سو روپے تھی۔ فوج کے محکمے میں یا اس سے متعلق شاید ہی کوئی ہندوستانی ملازم اتنی بڑی تنخواہ تک پہنچا ہو۔ حفیظ نے لوگوں کو انگریزی فوج میں بھرتی ہونے پر آمادہ کرنے کے لیے اپنا سانگ پبلسٹی کا محکمہ بڑی دانش مندی اور ہنر سے تشکیل دیا۔ اس کی ترتیب و تنظیم میں غیر معمولی انتظامی اور تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت بہم پہنچایا۔ ہر بڑے شہر میں سانگ پبلسٹی کا ایک ذیلی دفتر قائم کیا۔ خود ملک کے طول و عرض میں شہر شہر، بلکہ گاؤں گاؤں جا کر تقریبات منعقد کیں۔ اپنی نظموں اور گیتوں سے لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی۔ انھی گیتوں کا یہ بول زبان زدِ خاص و عام ہو گیا:

''اڑوسن پڑوسن کہے جو کہے — میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے''

ماہنامہ ''افکار'' کراچی کے ایڈیٹر صہبا لکھنوی ''افکار'' کے ''حفیظ نمبر'' میں لکھتے ہیں:

> ''حفیظ سرکاری ملازمت کے خلاف تھے لیکن بہت ہی بڑے بڑے مسلمان اہل الرّائے جن میں شیخ سر عبدالقادر، سر اکبر حیدری، نواب محمد اسماعیل خان، ہز ہائی نس نواب آف بھوپال حمید اللہ خان بھی تھے، اس جنگ میں انگریزوں کی فتح اس لیے چاہتے تھے کہ اگر انگریز ہار گئے تو ہندوستان پر جاپان، ہندوؤں کی ملی بھگت سے چھا جائے گا اور یہ دونوں قومیں مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنا لیں گی۔ ان کے لکھے ہوئے

فوجی گانے اور گیت سادھوؤں اور فقیروں (اور گانے والیوں اور سازو و
آواز کے ذریعے) ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ سپاہیوں
کے لیے بھی ولولہ انگیز تھے مگر جو بات بطور خاص قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ان
سب گیتوں میں ہندوستان کی آزادی کی روح سموئی ہوئی تھی۔''

جو لوگ خواہ مخواہ معترض ہیں کہ حفیظ جالندھری نے انگریزوں کی ملازمت کیوں قبول کی وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس زمانے میں اُردو کے اکثر نامور ادیب اور شاعر جنگ عظیم میں انگریزوں کے مدد و معاون تھے اور باقاعدہ انگریزی حکومت کی ملازمت میں تھے۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) تو اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ ان کے علاوہ کرنل فیض احمد فیض، کرنل مجید ملک، میجر چراغ حسن حسرت، کیپٹن سید ضمیر جعفری اور کئی دوسرے باقاعدہ فوج کی ملازمت میں تھے۔

قیام پاکستان کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قائداعظم پہلی بار لاہور تشریف لائے تو یونیورسٹی گراؤنڈ میں بہت بڑا جلسہ ہوا اس موقع پر حفیظ نے پنجاب کے امیروں اور وزیروں کی موجودگی میں اپنے قائد کے سامنے مہاجرین کے ناگفتہ بہ مسائل پر ایک آتشیں نظم پڑھی:

یہ صابر ہیں کوئی شکوہ نہیں اغیار سے ان کو
شکایت ہے فقط اپنے، ہی گھر کی مار سے ان کو
زمانہ منقلب ہے آسماں بدلا زمیں بدلی
مسلماں افسروں نے اپنی خو خصلت نہیں بدلی
گرے ہیں بن کے کرگس زندہ انسانوں کی لاشوں پر
کوئی نسخہ نہیں ہے کارگر ان بدمعاشوں پر
نہ مِنت کا اثر ان پر، نہ یہ سُنتے ہیں فریادیں
یہ ظالم کھودتے جاتے ہیں پاکستاں کی بنیادیں

خدارا قائداعظم! تو ہی تادیب کر ان کو
انھیں تعلیم دے، زنجیریٔ تہذیب کر ان کو

وزیروں کے رنگ اُڑ گئے۔ قائداعظم بھی مضطرب ہو گئے۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ نواب ممدوٹ نے جو ساتھ بیٹھے تھے،ان سے کہا ''حالات فوری طور پر ٹھیک ہونے چاہئیں۔ آئندہ ایسی شکایتیں نہ سنوں۔''

اس جرأتِ رندانہ پر قائداعظمؒ نے حفیظ صاحب کی پیٹھ ٹھونکی اور شاباش دی۔

۲۰-نومبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے حفیظ کو طلب فرمایا اور حکم دیا ''کشمیر جاؤ۔ افواج پاکستان کو تمھارے بڑھاووں کی ضرورت ہے''۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد حفیظ جالندھری نے آزادیٔ کشمیر کی جنگ میں عملی حصہ لیا تھا۔ زخمی بھی ہوئے۔ کشمیر کی جنگ کے متعلق شروع سے آخر تک اطلاعات یا خبرنامے (کمیونک) شائع کرتے رہے۔ آزاد کشمیر ریڈیو کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا اور اس کی تنظیم ذاتی دلچسپی لے کر کی۔ آزاد کشمیر کا ترانہ لکھا:

''وطن ہمارا آزاد کشمیر''

۱۹۴۷ء میں حفیظ صاحب کو افواج پاکستان کا ڈائریکٹر آف مورال مقرر کیا گیا۔ ان کا کام فوجی جوانوں اور افسروں کا اسلامی، شجاعانہ اور سرفروشانہ کردار بلند کرنا تھا۔ وہ بری، بحری اور فضائی افواج کے جوانوں میں گھل مل کر رہے اور ان کی ذہنی تربیت کی۔ حفیظ کی فطرت تھی کہ جو ذمہ داری بھی وہ قبول کرتے تھے اسے بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتے تھے۔ ۱۹۵۳ء تک اس خدمت پر مامور رہے۔ بطور ڈائریکٹر آف مورال ان کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہانہ تھی۔ اس وقت یہ ایک جرنیل کی تنخواہ تھی۔

۱۹۵۰ء میں حفیظ صاحب کا جشنِ پنجاہ سالہ بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ اس کا اہتمام راولپنڈی میں کیا گیا۔ یا تو اقبال کی زندگی میں اقبال ڈے منایا گیا تھا یا پھر حفیظ کی زندگی

میں ان کا جوبلی ڈے (جشن پنجاہ سالہ) منایا گیا۔اس کا زیادہ تر اہتمام فوج کے افسروں نے کیا۔تقریب کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر بریگیڈیئر گلزار احمد نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کہا:

''بعض حلقوں میں اس بات پر تعجب ظاہر کیا گیا ہے کہ حفیظ کی پنجاہ سالگی کی تقریب میں پاکستان کے فوجی عناصر کیوں پیش پیش ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ چنداں حیرت کی بات نہیں۔حفیظ کی شاعری میں جو نمایاں عنصر ہے وہ اسلاف کے زریں کارناموں کی روئیداد ہے اور افواج پاکستان کی یہ آرزو ہے کہ وہ شمشیر خارہ شگاف کے جوہروں پر قابو پانے کے لیے اپنے اسلاف کو مشعل راہ بنائیں۔ جب وہ غازیان و مجاہدین اسلام کے کارنامے حفیظ کی زبان سے سنتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ کس قدر بلند مقصد ان کے سامنے ایک نحیف سی جان پیش کر رہی ہے۔اگر وہ اس نحیف سی جان کی درازئ عمر کی دعا میں اپنا جائز حصہ لیں تو مجھے یقین ہے کہ اسے مقام تعجب نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ شاہ نامہ اسلام کے عظیم الشان مصنف کا جشن پنجاہ سالہ منانے کا حق انہی کو حاصل ہونا چاہیے جن کی خواہش ہے کہ فردا کا فردوسی ان کے کارناموں کو بھی اسی جذبہ و شوق سے نظم کرے جس طرح دیروز کے درخشاں کارناموں کو نظم کیا ہے۔

ہاں! ہمارا قصور اگر ہے تو صرف اتنا کہ ہم نے حفیظ کی موت کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا۔آخر ہم اپنے مقتدر فرزندانِ قوم کی خدمات کے اعتراف کے لیے ان کی موت ہی کا انتظار کیوں کیا کریں۔ کیوں نہ مردہ پرستی کی روایت کو توڑا جائے اور ساتھ ہی اس کلّیہ کو غلط ثابت کر دیں جس کے مطابق اصحابِ قلم کے قلم کی روشنائی ان کی موت کے بعد ہی ان کے مداحوں کی آنکھوں میں چمک پیدا کرتی ہے۔''

یہ اعتراض کہ حفیظ کا جشنِ پنجاہ سالہ فوجی افسران کی طرف سے کیوں منعقد ہو رہا ہے، ان ادبا اور شعرا نے اٹھایا تھا جو حفیظ کی شہرت و مقبولیت اور عوام اور خواص میں ان کی روز افزوں پذیرائی سے جلتے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے حاسدانِ تیرہ باطن کے جلنے کا یہ سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اسی دن سے شروع ہو گیا تھا جس دن اُردو شاعری کے اُفق پر حفیظ ایک دھماکے کے ساتھ طلوع ہوئے تھے۔ یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ اس کے مقابلے میں حفیظ کا جو رویہ تھا وہ اُن کے اِن اشعار سے ظاہر ہے:

خبثِ دَروُں دکھا دیا، ہر دہنِ غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے، ہنس دیا مسکرا دیا

- - - - - - -

نہیں عتاب ِ زمانہ، خطاب کے قابل
ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

- - - - - - -

یاروں کی برہمی پہ ہنسی آ گئی حفیظ
یہ مجھ سے ایک اور بُری بات ہو گئی

۱۹۵۵ء میں دیہی امداد و ترقی (ولیج ایڈ) کا ایک نیا محکمہ قائم ہوا۔ حفیظ صاحب اس محکمے کے ڈائریکٹر آف پبلسٹی مقرر ہو گئے۔ ان کی نگرانی میں اس محکمے کے آرگن کے طور پر رسالہ ''پاک سرزمین'' جاری ہوا۔ محکمہ ولیج ایڈ میں سید ضمیر جعفری ان کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ مرکزی دفتر کراچی میں تھا۔ اس عرصے میں یہ دونوں اہم شعرا رات دن اکٹھے رہتے تھے۔ دفتر بھی ایک تھا اور گھر بھی۔ جعفری صاحب کے بقول فرق صرف یہ تھا کہ دفتر میں حفیظ صاحب کا کمرہ دوسری منزل پر تھا اور جعفری صاحب کا گراؤنڈ فلور پر، جب کہ گھر میں جعفری اوپر والی منزل میں مقیم تھے اور حفیظ صاحب کا قیام نچلی منزل پر تھا۔ ۱۹۶۱ء میں ترقی ء دیہات کا محکمہ ''ادارہ تعمیرِ نو''

میں تبدیل کر دیا گیا۔

حفیظ جالندھری کو متعدد اعزازات و خطابات سے نوازا گیا۔ ابھی شہرت کا آغاز ہی تھا کہ اُن کے اُستاد مولانا عبدالقادر گرامی نے ایک مشاعرے میں ان کے کلام سے متاثر ہو کر انھیں ابوالاثر کا خطاب دیا۔ جو ان کی کنیت کے طور پر ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ وہ حفیظ جالندھری سے ابوالاثر حفیظ جالندھری ہو گئے۔ ریاست کپورتھلہ کے ایک مشاعرے میں جو مولانا گرامی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا جب نوجوان حفیظ نے یہ دو شعر پڑھے تو مولانا گرامی نے خوش ہو کر فرمایا ''حفیظ! تم ابوالاثر ہو۔''

رزاقِ دوجہاں کے خزانے کو کیا ہوا
ملتا ہے رنج، وہ بھی کسی کا دیا ہوا

- - - - - - -

وہ ہوئے پردہ شکن، انجمن آراء ہو کر
رہ گیا میں ہمہ تن، چشمِ تمنا ہو کر

مولانا گرامی نے نہ صرف انھیں ''ابوالاثر'' کہا بلکہ اصرار کے ساتھ فرمایا کہ تم اب ابوالاثر کی کنّیت اپنے نام کے ساتھ لگا لو۔

حفیظ کی خداداد شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ مبدائے فیض سے انھیں جو ترنم اور آواز کا جادو عطا ہوا تھا، اس نے ان کے کلام کی تاثیر کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ اس لحاظ سے ابوالاثر کی کنیت ان پر خوب سجتی تھی۔

برطانوی حکومت نے انھیں پہلے ''خان صاحب'' اور پھر ''خان بہادر'' کے خطابات سے نوازا مگر یہ دونوں خطابات ۱۹۴۶ء میں تحریک پاکستان کے دوران انھوں نے انگریزی حکومت کو واپس کر دیے اور پھر اپنے نام کے ساتھ کبھی خان بہادر نہیں لکھا۔

ریاست ٹونک نے انھیں ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا اور اس سلسلے میں وائس رائے

ہند کو چٹھی لکھ کر اس خطاب کا ''نوٹی فی کیشن'' جاری کرایا مگر حفیظ صاحب نے کبھی اپنے نام کے ساتھ ملک الشعرا نہیں لکھا۔

نظام حیدر آباد دکن والیٔ ریاست حیدر آباد نے حفیظ جالندھری کو نواب حسّان الملک بہادر کے خطاب سے نوازا۔ حفیظ جالندھری کی اسلامی اور نعتیہ شاعری کے اعتراف میں ان کے لیے حسان الملک کا خطاب تجویز کیا گیا تھا۔

ہز ہائی نس نواب سر حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال نے ''شاہ نامہ اسلام'' کی گراں قدر تصنیف پر حفیظ کو فردوسیٔ اسلام کا خطاب دیا۔

مبارک ہو تمھیں فردوسیٔ اسلام ہو جانا

پاکستان کا قومی ترانہ (National Anthem) لکھوانے اور اسے منظور کرنے میں حکومت نے بڑے تساہل اور لیت ولعل سے کام لیا اور یہ اہم قومی نوعیت کا فریضہ عرصہ دو سال تک سازشوں اور افسر شاہی کی بے سروپا موشگافیوں کی نذر ہوتا رہا۔ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر اگست ۱۹۴۹ء تک کئی مراحل طے کر لینے کے بعد معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے ''قومی ترانہ'' کے زیرِ عنوان آئے گا۔ کئی قلابازیاں کھانے کے بعد آخر اگست ۱۹۴۹ء میں حکومت پاکستان نے مسٹر چھاگلہ کی بنائی ہوئی دُھن جو ریڈیو پاکستان نے اپنے آرکسٹرا پر تیار کی تھی حتمی طور پر منظور کی اور ملک بھر کے شاعروں کو دعوت دی گئی کہ اس دُھن کے مطابق، اس کے وزن اور آہنگ پر اور اس کی بحر میں پاکستان کا قومی ترانہ تخلیق کریں۔ اس کے لیے دس ہزار روپے انعام بھی مقرر تھا۔ تقریباً آٹھ سو شاعروں نے طبع آزمائی اور قومی ترانہ کمیٹی کو قومی ترانے لکھ کر بھیجے۔ ان میں سے سینکڑوں شعرا تو دُھن کے مطابق وزن اور آہنگ ہی نہ قائم رکھ سکے۔ کمیٹی نے حفیظ جالندھری کے ترانے کو بہترین قرار دیا اور اُسے پاکستان کے قومی ترانے کے طور پر منتخب کر لیا۔ جونہی حفیظ کا لکھا ہوا یہ منتخب شدہ ترانہ اخبارات کی زینت بنا۔ ان سینکڑوں شاعروں کے سینے پر ،جن کی کاوشیں ناکام و نامراد ہوگئی تھیں، سانپ لوٹنے لگا اور اُن کی طرف سے بڑی شد و مد سے

مخالفت اور نکتہ چینی شروع ہوگئی۔ یہ سلسلہ دراز ہی ہوتا چلا گیا۔ حالانکہ حفیظ نے اپنا لکھا ہوا ترانہ خود منتخب نہیں کیا تھا اور یہ بھی اعلان کر رکھا تھا کہ وہ قومی ترانہ لکھنے کے عوض کسی قسم کا کوئی انعام قبول نہیں کریں گے۔ قومی ترانے کا خالق ہونا ہی اتنا بڑا اعزاز تھا کہ سینکڑوں شاعروں کو اس سے محرومی کا قلق تھا۔ وہ چیخ و پکار کرنے لگے اور حفیظ کے ترانے اور خود حفیظ میں طرح طرح کی خرابیاں اور برائیاں تلاش کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ان حاسدوں کا شور و غوغا گالی گلوچ تک اُتر آیا۔ ان مخالفوں میں مولانا عبدالمجید سالک جیسے حفیظ کے کئی بزرگ دوست اور یارانِ دیرینہ بھی شامل تھے۔ اس پر حفیظ کا ردِ عمل ان اشعار کی صورت میں سامنے آیا:

عرضِ ہنر بھی وجہِ شکایات ہو گئی
چھوٹا سا منہ تھا، مجھ سے بڑی بات ہو گئی
دیکھا جو کھا کے تیر، کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی
دُشنام کا جواب نہ سوجھا بجز سلام
ظاہر مرے کلام کی اوقات ہو گئی
یاروں کی برہمی پہ ہنسی آ گئی حفیظ
یہ مجھ سے ایک اور بری بات ہو گئی

بہرحال

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد، خدائے بخشندہ

یہ عظیم قومی اعزاز یعنی دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت خداداد کے قومی ترانے کا خالق ہونے کا شرف حفیظ جالندھری کو مل گیا۔ بے شک مخالفوں اور حاسدوں کے پیٹ میں مروڑ اٹھتے رہیں۔

حفیظ جالندھری نے بڑی متحرک اور فعال زندگی گزاری۔ زندگی بھر سفر میں رہے۔ خوب سیر وسیاحت کی۔ جس سفر کا آغاز ۱۹۲۱ء میں ماہنامہ ''اعجاز'' کے ایڈیٹر کے طور پر ہوا تھا اور وہ ہندوستان کے متعدد اہم شہروں میں جا کر کئی نامور ادبا اور شعرا سے ملے تھے۔ وہ سفر عمر بھر جاری رہے۔ ماہ نامہ ''اعجاز'' کی بندش کے بعد جب ان کے والد نے انھیں گھر سے نکال دیا تھا تو وہ پیدل کشمیر کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ہندوستان (اور اب پاکستان اور بھارت) کا کوئی شہر تو کیا شاید کوئی ایسا قابلِ ذکر قصبہ یا مقام ہو جہاں تک حفیظ صاحب نہ پہنچے ہوں۔ مختلف جلسوں اور مشاعروں میں شرکت انھیں کشاں کشاں ہر جگہ لے گئی۔ پھر برطانوی عہد میں سونگ پبلسٹی کے سربراہ کی حیثیت سے وہ قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں گھومے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب وہ پانچ سال تک افواج پاکستان کے ڈائریکٹر آف مورال رہے تو بری، بحری اور فضائی فوج کے ہر مستقر کا دورہ کیا۔ حتیٰ کہ کشمیر میں محاذِ جنگ کے اگلے مورچوں تک جا پہنچے اور گولیوں کی بوچھاڑ میں زخمی بھی ہوئے۔ سر میں زخم آئے۔ اسی طرح جنگ عظیم دوم کے دوران سونگ پبلسٹی کی تگ و دو میں برما میں مشرقی محاذِ جنگ پر اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے جاپانیوں کی قید میں جا پہنچے۔ تین ماہ ان کے قیدی رہے۔ آخر جاپانیوں نے انھیں شاعر سمجھ کر چھوڑ دیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں مدینہ منورہ گئے اور دربارِ رسالت میں حاضری دی۔ پھر مکہ مکرمہ گئے اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں سر عبدالقادر حفیظ صاحب کو لندن لے گئے۔ اُن دنوں سر عبدالقادر گورنمنٹ آف انڈیا آفس لندن میں تعینات تھے۔ حفیظ صاحب نے ڈیڑھ سال اور بعض روایتوں کے مطابق آٹھ ماہ لندن میں قیام کیا۔ پیرس بھی دیکھا۔ لندن میں جارج برنارڈ شا سے ملاقات کی۔

۱۹۴۷ء میں حضرت قائداعظمؒ کے ایما پر شملہ میں مقیم تھے کہ تقسیم ہند کا اعلان ہوتے ہی فسادات شروع ہو گئے۔ حفیظ اور ان کے مربی سر عبدالقادر قاتلوں میں گھِر گئے۔ سر عبدالقادر کے

بیٹے الطاف قادر جو اس وقت کرنل تھے۔ اپنے فوجی ٹرک میں حفیظ اور ان کے کنبے کو ہلاکت کے نرغے سے نکال کر لاہور لائے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان اس وقت انبالہ میں تھے۔ وہ بھی اسی قافلے میں شامل ہو گئے۔صدر ایوب سے حفیظ کی یہ پہلی ملاقات تھی جو ہر لحاظ سے ناقابلِ فراموش تھی۔ جب ۱۹۴۸ء میں حفیظ مشرقی پاکستان گئے تو وہاں ایوب خان کے مہمان ہوئے۔ جو اس وقت میجر جنرل اور مشرقی پاکستان کے جی او سی تھے۔

۱۹۵۸ء میں حکومت پاکستان نے فارسی کے اولین شاعر رودکی کی گیارہ سو سالہ برسی کی تقریب میں شرکت کے لیے اہلِ قلم کا ایک وفد اسٹالن گراڈ (روس) بھیجا۔حفیظ صاحب اس وفد کے سربراہ تھے۔اس وفد کو افریشیائی رائٹرز کانفرنس میں شرکت کے لیے تاشقند بھی جانا تھا۔حفیظ نے اس دورے میں تاشقند، سمرقند، باکو، اشک آباد، کوہ قاف، ماسکو، سائبیریا کی سیر و سیاحت سے لطف اٹھایا اور واپسی پر کابل اور قندھار بھی دیکھے۔

صدر ایوب کی حکومت میں کچھ سال محکمۂ تعمیرِ نو کے مشیر رہے۔ان کا عہدہ مرکزی حکومت کے جائنٹ سیکریٹری کے برابر تھا۔فرائضِ منصبی کے علاوہ صدر ایوب نے ایک خاص کام ان کو یہ دیا ہوا تھا کہ وہ تیزی سے ''شاہ نامہ اسلام'' مکمل کریں اور اس سلسلے کو زمانۂ حال تک لے آئیں۔اس سے پہلے شاہ نامہ اسلام کی چار جلدیں آ چکی تھیں۔جن میں آنحضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا حال بھی ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔اس کے بعد حفیظ نے شاہ نامہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔ تین سال وہ محکمہ تعمیرِ نو کے مشیر رہے۔ ہر طرح کی سرکاری سہولت انھیں میسر تھی۔ وسیع و عریض سرکاری بنگلہ، کار، اُردو زبان میں ٹائپنگ کی مہارت رکھنے والا ایک سٹینوگرافر۔مگر حفیظ صاحب نے بقول سید ضمیر جعفری اور عزیز ملک، شاہنامے میں ایک شعر کا اضافہ بھی نہ کیا۔ایک دن صدر کے سیکریٹریٹ سے کسی ڈپٹی سیکریٹری نے حفیظ صاحب کو فون کر کے پوچھا کہ سیکریٹری صاحب فرما رہے تھے کہ حفیظ سے کام کی پروگریس کا پوچھو۔انھوں نے کبھی اپنی پروگریس رپورٹ نہیں دی کہ اب تک شاہ نامہ میں مزید کتنا اضافہ کیا ہے۔حفیظ صاحب گویا ہوئے ''برخوردار یہ

سیکریٹری کون ہوتا ہے مجھ سے پوچھنے والا۔ میں کوئی کلرک ہوں جو اپنی پروگریس رپورٹ دوں۔ شعر لکھنے ہیں، فائل پر کوئی نوٹ تو نہیں لکھنا کہ انٹ شنٹ لکھ کر بھیج دوں۔ آئندہ مجھ سے ایسی بات نہ کرنا۔ وہ بولا ''دیکھیں نہ حفیظ صاحب! آخر آپ گورنمنٹ کے ملازم ہیں۔ آپ............'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ حفیظ صاحب برس پڑے ''تمھیں کس بے وقوف نے یہ بتایا ہے کہ میں گورنمنٹ کا ملازم ہوں۔ میں گورنمنٹ کا ملازم نہیں ہوں۔ گورنمنٹ میری ملازم ہے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے فون بند کر دیا اور بڑے جز بز ہو کر بڑبڑائے ''اب میں ایوب کے لیے شاہ نامہ لکھوں۔ لاحول ولاقوۃ'' اس واقعے کے راوی عزیز ملک ہیں جو اس زمانے میں ہر وقت حفیظ صاحب کے حاشیہ نشیں تھے۔

اسی زمانے کا ایک اور واقعہ ہے۔ جس سے بادشاہوں اور آمروں کے بارے میں حفیظ صاحب کے رویے اور ان کی عمومی افتادِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔ یہ واقعہ مجھے بریگیڈیئر گلزار احمد اور سید ضمیر جعفری، دونوں نے سنایا ہے۔ صدر ایوب کے بیٹے غالبًا طاہر ایوب کی شادی تھی۔ بریگیڈیئر گلزار احمد سید ضمیر جعفری صاحب کو لینے آئے کہ شادی کی تقریب میں اکٹھے چلتے ہیں۔ راستے میں سید ضمیر جعفری صاحب نے بریگیڈیئر صاحب سے پوچھا کہ حفیظ صاحب کا بھی پتہ کر لیں اگر ابھی تک نہ گئے ہوں تو ان کو بھی لے لیں۔ جب یہ دونوں حفیظ صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو ملازم نے بتایا کہ حفیظ صاحب اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔ یہ دونوں اصحاب ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حفیظ بنیان اور دھوتی میں ملبوس نیچے دری پر دراز ہیں اور کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ سید ضمیر جعفری صاحب نے ان کو دیکھتے ہی بآوازِ بلند کہا ''یہ کیا۔ ولی عہد کی شادی ہے اور ملک الشعرا ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔'' اس پر حفیظ صاحب نے روکھے پھیکے انداز میں کہا ''میں نہیں جا رہا'' بریگیڈیئر گلزار احمد گویا ہوئے۔ ''بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ صدر پاکستان کے ولی عہد کی شادی ہو اور شاعر پاکستان اس تقریب میں موجود نہ ہوں۔'' حفیظ بولے ''صدر صاحب کا حکم ہے کہ سہرا لکھ کر لاؤ۔ مجھ سے یہ فرمائشی کام نہیں ہوسکتا۔'' اور حفیظ شادی کی تقریب میں نہ گئے۔

اس کے چند ہی دنوں بعد حفیظ نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور پھر ۱۹۸۲ء تک کہ ان کا سال وفات ہے کبھی کوئی اور ملازمت اختیار نہیں کی۔

حفیظ صاحب کے پاس زندگی بھر نہ دولت کی کمی رہی نہ عہدوں کی۔ ان کے علاوہ شاید ہی کسی اور شاعر کی زندگی سے کوئی ایسی مثال دی جاسکتی ہو کہ سرکاری طور پر صرف چار جماعت تک تعلیم حاصل کرنے والا ایک شخص اتنے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا ہو جو بریگیڈیئر، جرنیلوں اور سینئر سی ایس پی افسران کے لیے بھی قابل رشک ہوں۔ پھر ہر شعبہء زندگی کے لوگوں میں حفیظ صاحب کی جو عزت تھی اور جتنا احترام تھا وہ تو کم ہی کسی کے حصے میں آیا ہوگا۔ جسٹس سر عبدالقادر اپنے بیٹوں منظور قادر (سینئر ایڈووکیٹ اور مرکزی وزیر قانون) اور الطاف قادر (لیفٹیننٹ جنرل الطاف قادر) سے فرمایا کرتے تھے کہ حفیظ بھی میرا بیٹا ہے۔ اسے آپ لوگ اپنا بڑا بھائی سمجھا کریں۔ اگر میرے پاس جائیداد ہوتی تو میں حفیظ کو بھی وراثت میں برابر کا حصہ دیتا۔''

۱۹۲۲ء-۱۹۲۳ء میں ہی پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) نے حفیظ کو اپنا ہم نشیں بنالیا تھا اور ان کے چھوٹے بھائی ذوالفقار علی بخاری نے شاعری میں ان کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ یہ وہی ذوالفقار علی بخاری ہیں جو بعد میں ریڈیو پاکستان کے کنٹرولر اور ڈائریکٹر جنرل رہے۔ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر شروع سے ہی جب سے انھوں نے حفیظ کے مجموعہء کلام ''نغمہ زار'' کا مطالعہ کیا، اپنے آپ کو حفیظ کا فین (Fan) کہتے تھے۔ علامہ اقبال حفیظ کو جینئس (Genius) کہتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی زبان سے یہ لفظ سن کر حفیظ کو کچھ سمجھ نہ آئی کہ اس لفظ کا کیا مطلب ہے بعد میں ڈاکٹر تاثیر سے ملاقات ہوئی تو اُن سے پوچھا کہ ''یار! مجھے بتا ''جی نی ایس'' کیا ہوتا ہے۔'' حفیظ جالندھری جب ۱۹۲۲ء میں ''شباب اُردو'' لاہور کے مدیر تھے تو سید عابد علی عابد اُن سے اپنے ڈرامے پر تبصرہ لکھوانے کے لیے ان کے دفتر جا پہنچے۔

علامہ اقبالؒ اگرچہ مولانا گرامی کے شاگرد رشید تھے مگر گرامی نے جس طرح کا قصیدہ حفیظ صاحب کی شان اور تعریف میں لکھا ایسا کوئی شعر اقبال کی تعریف میں نہیں کہا۔ غالبًا اس لیے

کہ اقبال پہلے ہی شہرت وعظمت کے اس مقام پر تھے جہاں انھیں گرامی کی کسی تعریف وتوصیف کی ضرورت نہ تھی۔ مولانا گرامی نوجواں حفیظ کی تعریف میں یوں رطب اللساں ہوئے:

فصاحت مجسّم، بلاغت مصوّر
کلامِ حفیظ است اللہ اکبر
معانی دل آویز و الفاظ دل کش
کلام حفیظ است یا سلکِ گوہر
معانی در آغوشِ الفاظ پنہاں
بآب است ماہی بآتش سمندر
معانی در الفاظ پنہاں و پیدا
بہم کردہ فکرش مگر شیر و شکر
فصیح معظّم بلیغِ مکرم!
حفیظ سخن گو حفیظِ سخن ور
بہ فہرست معنیست ناش مقدم
بہ بزمِ گرامی کلامش موخر

مولانا گرامی کی اس تحسین پر حضرت حفیظ جالندھری نے ان الفاظ میں اظہارِ تشکر کیا۔

''فخر ایشیا ملک الشعرا حضرت استاذ مکرم مولانا شیخ غلام قادر صاحب گرامی (قدس سرہ) نے اپنے اشعارِ آبدار اس عاجز کے کلام کے متعلق ارشاد فرما کر ذرے کو آفتاب بنا دیا تھا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ ان اشعار کو پڑھتا ہوں اور شرمندہ ہوتا ہوں، کہاں گرامی شہنشاہ اقلیم سخن اور کہاں حفیظ گدائے گوشہ نشیں اور عامی کج مج زباں۔ ہاں گرامی کی نسبت نے اس کو گرامی کر دیا۔

گرچہ خوردیم نسبتے ست بزرگ
ذرّہء آفتابِ تابانیم

محمد طفیل لکھتے ہیں:

''سرراس مسعود سے بھی ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ وہ بھی حفیظ صاحب کو بہت چاہتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر کھِل جایا کرتے تھے۔ سرراس مسعود حفیظ سے اتنی محبت کرتے تھے جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے۔''

سرراس مسعود نے جب علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری سنبھالی تو ان کی اچھی خاصی مخالفت ہوئی۔ سر ضیاالدین جو اُن سے پہلے وائس چانسلر تھے انھوں نے راس مسعود کے خلاف اودھم مچا دیا۔ سرراس مسعود نے یہ ذمہ داری اس لیے خود سنبھال لی تھی کہ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ ان کے عظیم دادا کی بنائی ہوئی مسلمانوں کی یہ عظیم یونیورسٹی جو برصغیر میں مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی تھی، تباہ ہو جائے۔

انہی دنوں کانپور میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس کی صدارت سرراس مسعود نے قبول کر لی۔ مخالفین نے سوچا وہاں بھی سرراس مسعود کی خبر لی جائے۔ چونکہ یہ وعدہ کر چکے تھے۔ اس لیے پیچھے ہٹنے کا سوال نہ تھا۔ انھوں نے حفیظ کو بھی لکھا کہ مشاعرے میں آنا۔ یہ بھی بتایا کہ میں فلاں ٹرین سے جاؤں گا۔ بہتر ہوگا کہ اکٹھے چلیں۔ حفیظ نے کسی وجہ سے معذوری کا اظہار کیا۔ اُن کا خط پھر آیا۔ کانپور میں میرے مخالفین بڑے زوروں پر ہیں۔ انھوں نے مجھے وہاں پہ ذلیل کرنے کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔ خطوط بھی آ رہے ہیں کہ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ لوگ اینٹیں اور پتھر مارنے کا پروگرام بنائے ہوئے ہیں۔ کیا اس موقع پر بیٹا باپ کا ساتھ نہ دے گا؟ ایسے خط پر حفیظ صاحب کا رُکنا مشکل ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق اکٹھے ہی پہنچے۔ چونکہ یہ مشاعرہ ایک کانفرنس کے موقع پر ہو رہا تھا اور کانفرنس کا افتتاح گورنر ہیلی کر رہے تھے جو کہ حفیظ کے پہلے ہی جاننے والے تھے۔ حفیظ صاحب سرراس مسعود کے ساتھ ڈائس پر بیٹھے تھے، باقی شعرا سامنے کی قطار میں۔ اب شعرا کا اصرار یہ تھا کہ حفیظ صاحب بھی ہمارے ساتھ آ کے بیٹھیں۔ اتنے میں گورنر صاحب بھی آ گئے۔ وہ

آتے ہی حفیظ صاحب سے بڑے تپاک سے ملے۔ پھر تو باقی شعرا اور حیران ہوئے۔ انھوں نے سوچا اب وہاں سے حفیظ صاحب کو اٹھانا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ سب چپ ہو گئے۔

ایک ایک کر کے شعرا پڑھتے گئے۔ جب گورنر صاحب کے جانے کا وقت آنے لگا تو سر راس مسعود نے کھڑے ہو کر حفیظ کا نام لیے بغیر تعریف شروع کر دی کہ اب میں ایک ایسے شاعر کو زحمت دینے والا ہوں، جس کی خدمات بے پناہ ہیں۔ جو موجودہ ہندوستان کا بہت بڑا شاعر ہے۔ پھر اس میں اور مجھ میں ایک بات مشترک بھی ہے کہ وہ بھی میری طرح گنوار ہے۔ میری مراد جناب حفیظ جالندھری سے ہے۔

اس تمہید کے بعد جب حفیظ صاحب نے پڑھنا شروع کیا تو سماں بندھ گیا۔ ان دنوں آواز میں بھی لوچ تھا۔ شعروں میں بھی نکھار تھا۔ خوب چمکے باقی چراغ ٹمٹما کر رہ گئے۔ اور...... اور............ اور کا شور بڑھتا ہی چلا گیا۔

صاحب صدر نے کہا ''گورنر صاحب تشریف لے جا رہے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد آپ کی خواہش کا احترام کیا جائے گا۔ حفیظ صاحب مزید اپنا کلام سنائیں گے۔''

پروگرام کے مطابق سر راس مسعود کے مخالفین بھی چوکس ہو رہے تھے۔ شعرا کا ایک بڑا حلقہ بھی اندر سے مشتعل بیٹھا تھا۔ سبھی نے اپنا اپنا رنگ جمانے کی کوشش کی مگر بات نہ بنی۔ لوگ حفیظ صاحب، حفیظ صاحب ہی پکارتے رہے۔ ناچار انھیں پھر دعوت کلام دی گئی۔ شر پسند عناصر اپنے پروگرام کی تکمیل کو بھول کر ان کے کلام کے سحر میں کھو گئے۔

مشاعرے سے واپسی پر حفیظ نے سر راس مسعود سے کہا ''جناب آپ نے تو فرمایا تھا کہ مشاعرے میں اینٹیں برسیں گی۔ وہ تو نہ برسیں۔''

''ضرور برستیں۔ لیکن ان پر تیرا جادو چل گیا۔'' سر راس مسعود نے کہا۔

اتنی شہرت و مقبولیت اور عزت و توقیر کے حامل شخص کی دلی آرزو کیا تھی۔ آیئے ذرا حفیظ کے دل میں جھانکتے ہیں۔

حفیظ صاحب کے نہایت قریبی دوست پروفیسر مرزا محمد منوّر اپنے مضمون ’’حفیظ صاحب کی باتیں‘‘ میں رقم طراز ہیں:

’’میں نے محکمہ انہار کی پانچ چھ سال نوکری کی تھی۔ایک روز باتوں باتوں میں حفیظ صاحب مجھ سے کہنے لگے۔’’یار!تم بھی بڑے ظالم واقع ہوئے ہو۔محکمہ انہار کی ملازمت کیوں چھوڑ دی؟ وہ زندگی تو بڑی رومان انگیز ہوتی ہے۔ٹھکانہ،عموماً کسی نہر کے کنارے، دیہاتی ماحول، خاموشی، درخت سبزہ، رنگ رنگ کی فصلیں، سادہ بھولے بھالے ملاقاتی، پرندوں کی نغمگی، حیوانوں کی مستی، یہ سب کچھ چھوڑ کر شہروں کی تنگ اور انسانیت کے لیے باعث ننگ فضا میں آ گئے ہو۔آخر کالج تو وہیں ہوں گے جہاں آبادی زیادہ ہوگی۔ پروفیسر تو دیہات سے بالکل کٹ کر رہ جاتے ہیں۔عوام سے ویسے ہی ان کا کوئی لین دین نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ پروفیسروں کی دنیا میں گھٹن ہوتی ہے۔شہروں سے دُور بھاگو منور! مناظر فطرت میں پناہ لو۔

اگر ملازمت کرنا ہے تو......کیا بتاؤں میرے نزدیک کون سی ملازمت سب سے زیادہ دلکش ہے۔اگر میرا بس چلتا تو میں کسی خاموش سی برانچ لائن میں ریل کا پھاٹک والا ہوتا...... میں جب کسی ایسے پھاٹک والے کو دیکھتا ہوں تو بڑا رشک آتا ہے۔......دیکھیں تو خاموش سی لائن دن میں کوئی دو تین گاڑیاں، پھاٹک بند کر دیا۔کوئی ہمسایہ نہ پاسبان۔نہ سائیکل ولوں کی گھنٹیاں، نہ تانگے والوں کی پیچ موڑ، نہ کمین اولاد آدم کا غوغا، کوارٹر کی بغل میں دو ایک سایہ دار درخت از قسم شیشم و بکائن لگا رکھے ہوں۔ایک دو بکریاں پال رکھی ہوں۔دونوں وقت ان کا تازہ دودھ نوشِ

جاں کیا جائے۔ چند مرغیاں ادھراُدھر کڑکڑا رہی ہوں۔ کوارٹر کے قریب
ہی چھوٹی سی کھوئی ہو جس میں سے حسب ضرورت ڈول ڈال کر پانی نکال
لیا جائے۔ ٹھنڈا پانی، ڈول بھی اپنا۔ رسی بھی اپنی۔ فارغ وقت میں غزل
لکھی جائے۔ گائی جائے، وسعتیں ہی وسعتیں۔ فراغتیں ہی فراغتیں۔''

حفیظ کے دل میں اس طرح کا پھاٹک والا بننے کی آرزو کیوں تھی اور انھیں کیوں ایسی زندگی پر رشک آتا تھا۔ اس کا کچھ اندازہ ان کی اپنی زندگی میں جھانکنے سے ہوگا۔ کس طرح کی زندگی وہ اپنے گھر میں اکثر گزارتے تھے یا کس طرح کی زندگی انھیں گزارنا پڑتی تھی۔

اس کی ایک جھلک محمد طفیل صاحب کے الفاظ میں:

''حفیظ صاحب ہر وقت ہمہ اقسام کی دوائیاں کھاتے رہتے ہیں۔ خمیرہ
مروارید کھائیں گے کہ دل کو تقویت پہنچے۔ خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا
کھائیں گے کہ اعصاب کو تقویت پہنچے۔ لبوب کبیر کھائیں گے کہ
اعضائے رئیسہ کو تقویت پہنچے۔ یہ ہمہ وقت ہمہ پہلوؤں سے فِٹ رہنا
چاہتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اعتراض ہے کہ یہ دوائیاں ہی کھاتے رہتے
ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ دوائیاں نہ کھاتے تو یہ آج سے بہت پہلے مر گئے
ہوتے۔ کون سی پریشانی ہے جو انھیں لاحق نہیں۔ شاعر ہیں تو وہ ان کے
خلاف، اس لیے کہ ان کے سامنے کم کسی کا چراغ جلتا ہے۔ رشتہ دار ہیں تو
وہ خلاف، اس لیے کہ یہ ہر ایک کے لیے امرت دھارا نہیں بن سکتے۔
دوست ہیں تو وہ خلاف اس لیے کہ مفاد ٹکراتے ہیں۔ تقویت ہے تو انھیں
صرف ایک کہ عوام و خواص کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ وہ انھیں سر آنکھوں پر
بٹھاتے ہیں۔''

نقوش کے خطوط نمبر میں حفیظ صاحب کے کچھ خطوط درج ہیں۔ خطوط کی تعداد

۳۲ ہے۔ یہ سب کے سب عزیز ملک صاحب کے نام ہیں۔ان خطوط میں جو چیز نمایاں ہے وہ ہیں ان کی زندگی کے کربناک پہلو جن میں بےقراری ہی بےقراری ہے، بےاطمینانی ہی بےاطمینانی ہے، مایوسی ہی مایوسی ہے۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ حفیظ صاحب جیسا انسان کہ جسے ڈھیروں خوشیاں ملی ہوں۔ جسے اچھی تنخواہیں ملی ہوں۔ جسے فقیر سے لے کر وزیر تک نے چاہا ہو۔ وہ اتنا دُکھی بھی ہوسکتا ہے۔ان کے خطوط سے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''یہاں سوائے معاندت کے اور کچھ نہیں۔ ابھی مجھے دوزخ میں سے گزرنا ہے اور یہ راہ تنہا ہی طے کرنی ہے۔ جیلانی صاحب سے میرے مقدمے کی بابت بھی پوچھ کر لکھیے۔'' (۱۱دسمبر۱۹۵۱ء)

- - - - - - -

''سعیدہ میری بیٹی جو اس وقت موت اور زندگی کی حالت میں اور جس کی مرگی اور ہسٹیریا کے دوروں کے سبب ہم سب موت کے منہ میں ہیں، اس کو ذرا افاقہ ہو تو میں اس قافلے کو لے کر لاہور پہنچ جاؤں''

''میرا معاملہ محکمے سے الجھ گیا ہے۔ وہ مجھے تین سال سے پہلے قانوناً جواب نہیں دے سکتے۔اس لیے ٹھن گئی ہے۔

اُدھر دنیا ہے اور دنیا کے بندے

اِدھر میرا خدا ہے، اور میں ہوں

(۲۱مئی ۱۹۵۳ء)

- - - - - - -

''میرے گھر میں اللہ ہی اللہ ہے۔سعیدہ بیمار، فہمیدہ بیمار، اس کا شیرخوار بچہ بیمار، میں بیمار، ہسپتال میں بیوی بیمار، اللہ کریم ہے اور شاہد عادل اور شافی مطلق۔'' (۱۴دسمبر۱۹۵۳ء)

علالت، چاروں طرف علالت، آسمان و زمیں علالت سے بھر گئے ہیں۔ میری ساری دنیا مریض و علیل ہے۔ ''سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا تہم۔'' میری بیوی سرطان کے اثر سے، جو کچھ ہونے والا ہے، وہ پیشِ نظر ہے۔ میری حالتِ مادی، میری حالتِ ذہنی کو بھی اُجاڑ کیے دے رہی ہے۔''

(۱۵فروری۱۹۵۴ء)

- - - - - - -

'' آج میری ۳۵ برس کی رفیقہء حیات نے داعیء اجل کو لبیک کہہ دیا۔ آج سہ پہر، ساڑھے تین بجے، میری زندگی کی یہ جنگ بھی میری شکست پر فیصل ہوگئی۔

جینا پڑے گا اے جانِ شیریں
کرنی پڑے گی تلخی گوارا

(۷مارچ۱۹۵۴ء)

- - - - - - -

'' گزشتہ دو ماہ سے تقریباً چارپائی پر ہی ہوں اور اس وقت ایسی حالت ہے کہ تم مجھے پہچان نہیں سکتے۔ چل پھر نہیں سکتا۔ لیکن امید قائم ہے۔

ابھی باقی ہے معیادِ مصیبت
ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں

(۷جولائی۱۹۵۵ء)

'' گزشتہ ۳۰ اپریل ۱۹۶۱ء کو دراصل میں مر چکا تھا۔ میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ۳۰ اپریل سے پہلے اگر کوئی تاثر میرے قلب پر اس طرزِ سلوک کا تھا بھی تو وہ موت نے دور کر دیا ہے۔ مجھے تو اب ان کانٹوں سے رنج

نہیں۔جن سے میری جان فگار ہے۔ذبح شدہ جانور ارادے سے حرکت نہیں کیا کرتا۔'' (۲۳ستمبر۱۹۶۱ء)

- - - - - - -

''جس الجھن میں گرفتار ہوں۔اگر یہ شیطان ہی کی آنت ہے تو واقعی یہ کوئی ایسی آنت نہیں جس سے چھٹکارے کی صورت کسی قصاب کی چھری سے ہو سکے۔بس اللہ ہی چاہے تو رہائی اور نہ چاہے تو بہر حال یہ آنت سانپ کی طرح مجھے کس چکی......اور یہ ہے میری گھریلو زندگی۔''(۱۹۶۱ء)

- - - - - - -

''ننھی چھ برس سے بھی کم عمر کی، ناتواں اور ہڈیوں کا ڈھانچہ۔کئی کئی مرتبہ عفونت اور جاں کنی میں مبتلا قے کر کے بے ہوش اور ساقط النبض ہو جاتی ہے۔تم نہیں جانتے کہ میں مر نہیں چکا تو قریب المرگ ہوں۔جانکنی میں ہوں۔میرا سر کہیں ہے، دھڑ کہیں ہے، بازو کہیں ہیں۔

غم موجود ہے آنسو بھی ہیں کھا تو رہا ہوں، پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

(۱۹۶۲ء)

- - - - - - -

''شمشیر کا معرکہ جہاد اصغر ہے اور قلم کا معرکہ جہاد اکبر۔میں نے فیصلہ تو وہی پرانا ہی قائم کر رکھا ہے کہ راولپنڈی کے قریب مری کی پہاڑیوں میں عقابی گھونسلہ۔'' (۳۰اپریل۱۹۵۳ء)

- - - - - - -

اور اب حفیظ صاحب کا ایک اور روپ ملاحظہ ہو۔ سید ضمیر جعفری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ایک بات سے جو تم نے اس خط میں لکھی ہے، مجھے اختلاف ہے۔ نہیں ضمیر نہیں۔ مجھ میں تمرد کی رمق نہیں ہے۔ میری فطرت میں خوشامد اور جھکنا نہیں۔ انکسار اور بات ہے اور دنیاوی طاقت کے سامنے سجدہ ریزی اور بات ہے۔ میں بھی جھکتا ہوں مگر بڑے دل، برے ہنر، بڑی اخلاقی و تخلیقی شخصیت کے سامنے۔ بڑے اخلاص اور بڑی محبت کے سامنے۔ یہ لوگ جن کو تم نے بڑے لوگ کہا ہے۔ میری نظر میں بڑے نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو محض اس طرح کے بڑے جیسے کوئی بڑے بڑے سینگوں والا بیل۔ بڑا اژدھا۔ مجھے ان سے کوئی غرض نہیں۔

باقی رہی ترانے کی بات۔ یہ سخن گسترانہ بات ہے۔ میں پاکستان سے محبت رکھتا ہوں۔ یہ وطن ہمارے لیے انعام ہے۔ میں پاکستانی فوج کی عزت اور احترام کو اپنا ایمان سمجھتا ہوں۔ میں پاکستان کے جھنڈے کو اسلام کا جھنڈا سمجھتا ہوں۔'' (افکار، حفیظ نمبر، صفحہ ۱۲۰)

- - - - - - -

''عزیر (عزیز ملک) کی رنجش میرے سر آنکھوں پر۔ آخر میرے دوستوں کو مجھ سے رنجیدہ ہونے اور مجھے اپنے قدموں پر جھکانے کا حق حاصل ہے۔ عزیز غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ مجھے تو وہ اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ البتہ بچوں کو بعض اوقات ڈانٹ ڈپٹ بھی کرنی پڑتی ہے۔ وہ خفا ہو جاتے ہیں تو من بھی جاتے ہیں۔ یہی معاملہ عزیز کا ہے۔ میرے نزدیک تو یہی ہے۔ اُس کی وہ جانے۔ تم میرا اک کام کرو۔ اُس کو

ڈھونڈو۔تنہائی میں لے جاؤ۔اُس کو اُٹھالو۔اور منہ چوم لو۔وہ حیران ہو کر دیکھے تو بتادو کہ یہ حفیظ کی طرف سے ہے۔ (کراچی ۱۴دسمبر ۱۹۵۵ء)

حفیظ صاحب کے ہاں اولاد نرینہ نہیں تھی۔بیٹیاں ہی بیٹیاں تھیں۔کوئی کسی بیوی سے، کوئی کسی بیوی سے۔اس لیے سگی ماں والا پیار کم ہی کسی کو ملا۔بدمزگی ہی بدمزگی رہی۔ایک بیٹی تسنیم تو آخر آخر پاگل ہو گئی تھی۔حالانکہ اچھی خاصی شاعرہ تھی۔تسنیم حفیظ کے نام سے مشاعروں میں شریک ہوتی تھی۔اپنا رنگ جما لیتی تھی۔جس مشاعرے میں حفیظ جاتے تھے۔تسنیم نہ جاتی تھی۔جس میں تسنیم پہنچ جاتی تھی حفیظ نہیں پہنچتے تھے۔غرض ایک دوسرے کو آپس میں شکایتیں ہی شکایتیں تھیں۔گھر کا سکون عنقا ہی عنقا تھا۔گھر کے تمام افراد میں ایک دوسرے سے بیزاری ہی بیزاری تھی۔

حیرت ہے کہ حفیظ صاحب ایسے دردناک ماحول میں زندہ رہے۔لکھتے رہے۔دنیائے شاعری پر چھائے رہے۔

حفیظ صاحب کی شخصیت اور کردار کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کرتے ہیں۔پروفیسر مرزا محمد منوّر سے زیادہ انھیں کون جانتا ہے۔فرماتے ہیں:

> ''حیرت ہے کہ اتنے بڑے شاعر ہونے کے باوجود حفیظ صاحب اپنے اوپر خواہ مخواہ کی بے نیازی طاری نہیں کرتے۔ورنہ دیکھا یہ ہے کہ جو عزیز یا بزرگ ذرا بھی شاعری میں مبتلا ہو گیا۔اس نے بہت سی رعایات اپنے لیے خود محفوظ کر لیں۔وعدہ کرنا اور بھول جانا۔خط کا جواب نہ دینا۔کوئی کام اپنے ذمہ لینا تو بھول جانا۔اپنے دکھ کے گھمنڈ میں دوسروں کے غم میں شریک نہ ہونا۔ہر دم نازک مزاجی کی ردا اوڑھے پھرنا۔ہر دم تکلف کا پل صراط عبور کرتے دکھائی دینا۔علی ہذا القیاس۔مگر حفیظ صاحب کا عالم یہ ہے کہ اگر وہ کسی عزیز یا بزرگ کی فرمائش یا کوئی ذمہ داری قبول کر لیں تو

جب تک وہ انجام پذیر نہ ہو، انھیں ہرگز چین نہیں آتا۔ خط کہیں سے اور کسی طرف سے بھی آجائے، جواب فوراً دے دیتے ہیں اور مفصل۔ کوئی ملاقاتی آکر دروازے پر آواز دے یا گھنٹی بجائے۔ تو فوراً پتہ لیتے ہیں۔ اگر کوئی ملازم یا عزیز پاس نہ ہو تو خود بھاگتے ہیں۔ واقعی بھاگتے ہیں۔ شیو بنا رہے ہوں تو برش ہاتھ میں ہوتا ہے۔ منہ پر جھاگ چپکی ہوتی ہے اور وہ اوپر سے جھانک کر فرماتے ہیں آیئے۔ آیئے۔ کھانا کھا رہے ہوں تو لقمہ منہ میں ہوتا ہے اور ملاقاتی کی اطلاع پا کر اُٹھ بھاگتے ہیں۔

اب مصیبت یہ ہے کہ وہ جواباً ہر شخص سے اسی ذمہ داری اور شدت احساس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کے حکم کی تعمیل فوراً ہونی چاہیے۔ خط کا جواب فوراً ملنا چاہیے۔ وہ کسی کے گھر جائیں تو صاحب خانہ کو فوراً حاضر ہونا چاہیے۔ ورنہ حفیظ صاحب طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں۔ خاص طور پر وہ اگر کسی عزیز کے گھر پہنچیں اور وہاں للکار، پکار یا گھنٹی کی جھنکار پر لبیک کی صدا میں دیر ہو جائے تو بگڑ کر چل دیتے ہیں۔ بعض اوقات چلتے چلتے کچھ تبرکات بھی فی البدیہہ ارشاد کر دیتے ہیں۔ مگر جو انھیں جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ یہ غصہ تیز ہوا کا جھونکا ہے۔ اِدھر آیا، اُدھر گیا۔ گالیوں کے بارے میں ان کا اپنا ارشاد ہے کہ یہ کثرتِ استعمال کی وجہ سے بے معنی ہو گئی ہیں۔''

ایک روز اِن کے ایک نہایت عزیز دوست نے جو پنجاب یونیورسٹی کے ایک شعبے کے صدر ہیں۔ حفیظ صاحب کی موجودگی میں ذیل کا واقعہ سنایا۔

'' حفیظ صاحب گھر پر تشریف لائے۔ میں غسل خانے میں تھا۔ میری والدہ محترمہ نے دروازے پر جا کر کہا۔ ذرا سی دیر انتظار فرمائیں۔ چار

جب تک وہ انجام پذیر نہ ہو، انھیں ہرگز چین نہیں آتا۔ خط کہیں سے اور کسی طرف سے بھی آجائے، جواب فوراً دے دیتے ہیں اور مفصل۔ کوئی ملاقاتی آکر دروازے پر آواز دے یا گھنٹی بجائے۔ تو فوراً پتہ لیتے ہیں۔ اگر کوئی ملازم یا عزیز پاس نہ ہوتو خود بھاگتے ہیں۔ واقعی بھاگتے ہیں۔ شیو بنارہے ہوں تو برش ہاتھ میں ہوتا ہے۔ منہ پر جھاگ چپکی ہوتی ہے اور وہ اوپر سے جھانک کر فرماتے ہیں آیئے۔ آیئے۔ کھانا کھارہے ہوں تو لقمہ منہ میں ہوتا ہے اور ملاقاتی کی اطلاع پا کر اُٹھ بھاگتے ہیں۔

اب مصیبت یہ ہے کہ وہ جواباً ہر شخص سے اسی ذمہ داری اور شدت احساس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کے حکم کی تعمیل فوراً ہونی چاہیے۔ خط کا جواب فوراً ملنا چاہیے۔ وہ کسی کے گھر جائیں تو صاحب خانہ کو فوراً حاضر ہونا چاہیے۔ ورنہ حفیظ صاحب طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں۔ خاص طور پر وہ اگر کسی عزیز کے گھر پہنچیں اور وہاں للکار، پکار یا گھنٹی کی جھنکار پر لبیک کی صدا میں دیر ہو جائے تو بگڑ کر چل دیتے ہیں۔ بعض اوقات چلتے چلتے کچھ تبرکات بھی فی البدیہہ ارشاد کر دیتے ہیں۔ مگر جو انھیں جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ یہ غصہ تیز ہوا کا جھونکا ہے۔ اِدھر آیا، اُدھر گیا۔ گالیوں کے بارے میں ان کا اپنا ارشاد ہے کہ یہ کثرتِ استعمال کی وجہ سے بے معنی ہو گئی ہیں۔''

ایک روز اِن کے ایک نہایت عزیز دوست نے جو پنجاب یونیورسٹی کے ایک شعبے کے صدر ہیں۔ حفیظ صاحب کی موجودگی میں ذیل کا واقعہ سنایا۔

'' حفیظ صاحب گھر پر تشریف لائے۔ میں غسل خانے میں تھا۔ میری والدہ محترمہ نے دروازے پر جا کر کہا۔ ذرا سی دیر انتظار فرمائیں۔ چار

پانچ منٹ گزر گئے۔ حفیظ صاحب نے تاؤ کھا کے للکارا۔ ''او۔ ڈاکٹر!
او۔ڈاکٹر!'' میں غسل خانے سے نکلتا تو مجھے کوئی اطلاع دی جاتی۔ والدہ
بیچاری پھر دروازے پر تشریف لے گئیں اور پھر کہا۔ آپ چند منٹ انتظار
فرمائیں۔ وہ ابھی آتے ہیں۔''

اب حفیظ صاحب کا پارہ چڑھ چکا تھا۔ لہٰذا بڑے طنزیہ لہجے میں پورے
ادب کے ساتھ میری والدہ سے کہا ''اماں جان! اگر اُسے اندر ہی بٹھانا تھا
تو بیٹی جن لینا تھی۔ بیٹا کاہے کو جنا تھا اور چلے گئے۔''

''گزشتہ نومبر میں حفیظ صاحب اور میں لاہور میں ایک کرم فرما محترم سے
مل کر ماڈل ٹاؤن کی طرف لوٹے۔ رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ چاندنی
چھٹکی ہوئی تھی۔ لاہور میں فروری اور نومبر کی چاندنی خاصی بے ایمان
ہوتی ہے۔ حفیظ صاحب موڈ میں تھے۔ لہرا لہرا کر باتیں کر رہے تھے۔ وجہ
یہ تھی کہ ہم جن کرم فرما سے مل کر آ رہے تھے ان کا اسم گرامی جسٹس محمد رستم
کیانی ہے۔ کیانی صاحب کی باغ و بہار باتیں دل و دماغ پر بدستور
خوشبوئیں چھڑکائے جا رہی تھیں۔ حفیظ صاحب خوش تھے۔ بہت خوش۔
جب ہم حفیظ صاحب کی اسٹیٹ میں داخل ہوئے تو حفیظ صاحب چلتے
چلتے رک گئے اور معاً سنجیدہ ہو کر مجھ سے کہنے لگے ''منور یار! غور تو کرو۔
حفیظ کیا تھا۔ کیا بن گیا۔''

حفیظ چوتھی جماعت سے بھاگ گیا مگر شاعر اسلام حسان الملک اور فردوسیٔ اسلام
کہلایا۔ غریب تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر قلیوں کی طرح لوگوں کا
سامان اُٹھایا کرتا تھا۔ اب ملا جلا کر دو ہزار تنخواہ پاتا ہے۔ (۱۹۶۶ء کی بات
ہے) مستقل وظیفہ الگ ہے۔ ابھی لڑکا تھا گھر چھوڑنا پڑا۔ سر چھپانے کو

جگہ نہ تھی۔ اب ایک کوٹھی یہ ہے۔ ایک کوٹھی وہ ہے۔ ایک لان، دوسرا لان،
یہ درخت، وہ پھول، حفیظ ایک گمنام بھگوڑا تھا۔ مگر اس کی شہرت برعظیم پاک
و ہند کی حدود کو عبور کر کے بیرونی ممالک میں پہنچ گئی۔ اس کا کلام منبر پر پڑھا
گیا۔ محفلوں میں گایا گیا۔ حفیظ کو خانقاہوں میں بلایا گیا۔ اس کو درباروں
میں ممتاز مقام پر بٹھایا گیا۔ منور یار! اللہ نے مجھے یہ سب کیوں عطا کر دیا؟
اس کا سبب فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ میں حضور اکرم ﷺ کا نام لیوا ہوں
اور لطف یہ ہے کہ یہ نام بھی گلے کے اوپر ہی اوپر سے نکلتا رہا۔ اگر یہ نام
دل کی گہرائیوں سے نکلتا تو میں نہ جانے کیا ہوتا۔''

مگر محمد طفیل مدیر نقوش نے مخدومی میں ایک ایسا واقعہ قلم بند کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حفیظ صاحب حضرت محمد ﷺ کا نام اور اسلام کا پیغام محض گلے کے اوپر ہی اوپر سے نہیں گاتے رہے۔ یہ نام اور پیغام ان کے خون میں رچا بسا ہوا تھا۔

''حفیظ صاحب اسلام اسلام بہ طور تکیہ کلام نہیں پکارتے رہے بلکہ ان کی
رگ رگ میں اسلام رچا ہوا ہے۔ اسلام سے تمسخر یا کسی قسم کی زیادتی کا
جھیل جانا ان کے بس کی بات نہیں۔ انھوں نے ہمیشہ دوسرے مذاہب کا
بھی احترام کیا ہے۔ جس کی متعدد مثالیں ان کے کلام سے ڈھونڈی
جا سکتی ہیں۔ خاص کر ہندو مذہب سے ان کا لگاؤ اپنی رنگا رنگی کے اعتبار
سے ایسا ہے جس کی مثال اُردو شاعری میں شاذ ہی ملے گی۔ مگر اس کا
مطلب یہ نہیں کہ کوئی ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائے اور چین کی
بنسری بجائے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کا ایک واقعہ ہے۔ ماڈل ٹاؤن
میں جہاں کہ یہ رہتے ہیں کونے میں ایک مسجد ہے۔ ایک دن یہ مسجد
غیر مسلم کارندوں کی زد میں آ گئی تھی۔ دھڑا دھڑ گرائی جا رہی تھی۔ اور وہ

وقت صبح کاذب کا تھا۔ کسی نے آ کر حفیظ صاحب کو اطلاع دی کہ مسجد گرائی جارہی ہے اور ماڈل ٹاؤن کی ہندو اکثریت کھڑی خندہ استہزا فرمارہی ہے۔ یہ ابھی سو کے اٹھے ہی تھے۔ صرف پاجامہ اور بنیان پہنے ہوئے تھے۔ یہ اسی حالت میں ننگے پاؤں اپنی بندوق اٹھا کر لپکے۔ وہاں پہنچ کر دھاڑے ''خبردار جواب کسی نے گینتی چلائی۔ خدا کی قسم میں مسجد کو مسمار کرنے والوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' یہ سننا تھا کہ کارندے پیچھے ہٹ گئے۔ تماشائی بھی کھسک گئے۔''

محمد طفیل ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ایک دن میں حفیظ صاحب کے ہاں جانکلا۔ اچانک مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ سینے سے لگایا۔ دعائیں دیں۔ اُن کی کوٹھی دیکھی۔ کچھ کچھ نقشہ اسلامی طرز عمارت کا اور تو اور کوٹھی میں ایک درخت کھجور کا بھی۔ میں نے پوچھا'' کھجور کا درخت؟

''ہاں یہ درخت میں نے بطور خاص لگوایا تھا۔''

کیوں؟

''اس لیے کہ یہ درخت اسلامی روایات کا مظہر ہے۔ ایک سمبل ہے۔''

''انسان کا دل مومن ہونا چاہیے۔ ایسی باتوں میں کیا رکھا ہے۔''

''رکھا ہے۔ تمھیں نہیں معلوم کہ یہ علاقہ (ماڈل ٹاؤن) ہندوؤں کا گڑھ تھا۔ ان ہندوؤں میں رہ کر جب میں نے یہ کوٹھی بنوائی تو اس پہچان کے لیے کہ یہ کوٹھی ایک مسلمان کی ہے۔ اس کا نقشہ اسلامی عمارت کی طرز پر بنوایا۔ پھر یہ کھجور کا درخت بھی اسی لیے لگویا —— بے شک یہ بات چھوٹی سی ہے مگر میں یہ تمیز کرانا چاہتا تھا کہ کوٹھی کسی مسلمان کی ہے اور یہ میرے

دل کی خوشی تھی۔ مانتا ہوں کہ یہ کوئی نیکی کا کام بھی نہیں مگر میں کیا کروں۔ میں مسلمان ہوں۔"

ترقی پسندوں سے حفیظ صاحب کے اختلاف کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ ان ادیبوں اور شاعروں کو جو ترقی پسندی کا علم اٹھائے ہوئے تھے، کارل مارکس کے پیروکار سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں محمد ﷺ کا نام لیوا ہوں۔ یہ کارل مارکس کے نام لیوا ہیں۔ ان ترقی پسندوں کی شاعری کا محرک ان کے اندر سے پھوٹنے والا کوئی فطری شعری جذبہ نہیں بلکہ وہ منشور ہے جو کمیونزم سے ماخوذ ہے۔

جوش ملیح آبادی بھی اپنے آپ کو ترقی پسند اور شاعر انقلاب کہتے تھے۔ یہاں جوش کے بارے میں حفیظ کے رویہ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۷ ستمبر ۱۹۷۰ء کو الیکشن کے روز ٹیلی ویژن پر ایک مشاعرہ بھی برپا تھا۔ جس میں اور اچھے شاعروں کے ساتھ فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری اور جوش ملیح آبادی بھی شریک تھے۔ جب سب پڑھ چکے تو آخر میں جوش صاحب کو پڑھوایا گیا۔ جوش صاحب کے شعروں پر سب نے داد دی۔ مگر حفیظ صاحب دم سادھے بیٹھے رہے بلکہ قدرے تکدّر کے عالم میں بیٹھے رہے۔ اس دوران کیمرہ مین کو شرارت سُوجھی تو دیکھا گیا کہ حفیظ صاحب نفرت جمع حقارت ایسی نظروں سے جوش صاحب کو دیکھ رہے ہیں۔ اس سین پر ناظرین کو بھی ہنسی آ گئی۔ انہی دنوں میں نے پوچھا "جناب! جوش صاحب سے ناراض ہیں کیا؟"

"اُس سے ناراض نہیں ہوں۔ اس کی شاعری سے ناراض ہوں۔"

"کیا معنی؟"

"وہ شاعر نہیں۔ تُک بند ہے۔"

"تک بند نہ کہیے۔ ان کے ہاں تو الفاظ اور خیالات آبشار کی طرح گرتے ہیں۔"

"خیالات نہیں، الفاظ گرتے ہیں۔"

''کیا یہ کم خوبی ہے؟''

''الفاظ کے لیے لغت دیکھی جا سکتی ہے۔ پٹھانی لہجے میں شعر سننے کی کیا ضرورت ہے۔''

حفیظ ایک بہت اچھے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ بڑے مشاعرہ باز شاعر تھے۔ بعض شاعر بڑے اچھے ہوتے ہیں مگر انھیں مشاعرے میں اپنا کلام سنانے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ حفیظ دونوں شعبوں میں یکتا اور منفرد تھے۔ مشاعروں میں کم ہی شاعروں کا چراغ ان کے سامنے جلتا تھا۔ وہ مشاعرے پر چھا جایا کرتے تھے۔ سامعین ان سے ان کی کئی مشہور نظمیں اصرار کے ساتھ سنا کرتے تھے۔

خاص کر ''ابھی تو میں جوان ہوں'' اور ''رقاصہ'' کی تو بڑی مانگ رہتی تھی۔ ہر مشاعرے میں سامعین کی طرف سے آوازیں بلند ہوتیں۔ حفیظ صاحب! ''ابھی تو میں جوان ہوں'' سنایئے۔ دوسری جانب سے آوازیں آتیں۔ حفیظ صاحب! ''رقاصہ۔ رقاصہ''

حفیظ صاحب سٹیج پر آ کے مائیک سنبھالتے ہی نثر و نظم دونوں سے کام لینا شروع کر دیتے تھے۔ عموماً کلام سنانے سے پہلے سامعین کی طرف دو تین چبھتے ہوئے جملے لڑھکا دیا کرتے تھے۔ لندن سے واپسی پر جب ایک انگریز خاتون انیلا ان کے پیچھے پیچھے لاہور آ گئیں اور جلد ہی ان سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئیں تو انہی دنوں لاہور کے ایک مشاعرے میں یہ اپنی نظم ''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے'' سنا رہے تھے کہ ایک طرف سے آواز آئی۔ ''حفیظ صاحب! جب اپنے وطن میں سب کچھ ہے تو آپ انگریز بیوی کیوں لائے ہیں۔'' اسی قسم کی دو تین آوازیں اور گونجیں۔ حفیظ صاحب اس جانب اشارہ کر کے کہنے لگے۔ یار! ان کو چپ کراؤ۔ میں بیوی سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا بیوی کے رشتہ داروں سے ڈرتا ہوں۔''

دہلی کے ایک مشاعرے میں حفیظ صاحب اپنی غزل سُنا رہے تھے کہ فراق گورکھپوری نے دفعتاً بلند آواز سے کہا: ''واہ۔ حفیظ پیارے۔ کیا گلا پایا ہے۔ یار میرا سارا کلام لے لو اور اپنی آواز مجھے دے دو۔''

حفیظ فی الفور شعر کو ادھورا چھوڑ کر فراق سے کہنے لگے ''جناب فراق صاحب۔ میں آپ کا نیاز مند ہوں۔ میری آواز تو کیا آپ مجھے بھی لے لیجیے لیکن خدا کے لیے مجھے اپنا کلام نہ دیجیے گا۔''

دلی کے ایک ہند و پاک مشاعرے میں ساغر نظامی اپنی غزل سنا رہے تھے۔ جب انھوں نے یہ شعر پڑھا :

بہت تلخ تھی زندگانی مگر
گلوں گلرخوں میں بسر ہو گئی

تو حفیظ صاحب نے بے اختیار داد دیتے ہوئے کہا۔ ''سبحان اللہ! کیا بات ہے۔ یعنی بسر کے ہیں شیریں۔ زندگی تلخ تھی بسر ہوگئی یعنی شیریں ہوگئی۔ (حفیظ صاحب لفظ کے صریحاً غلط استعمال کی نشاندہی کر رہے تھے۔)

کسی رئیس کے ہاں دعوت تھی۔ دیگر معززین کے علاوہ کئی شاعر اور ادیب بھی موجود تھے۔ ایک طرف جوش ملیح آبادی چند دوسرے شاعروں کے ساتھ محوِ ناؤ و نوش تھے۔ جوش صاحب کو نہ جانے کیا سُوجھی۔ فرمانے لگے وہم مونث ہے جو لوگ اسے مذکر لکھتے ہیں غلطی کرتے ہیں۔

پنڈت ہری چند اختر نے فوراً تردید کرتے ہوئے کہا: ''نہیں قبلہ! آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔ وہم مؤنث نہیں۔ مذکر ہے۔''

لیکن جوش صاحب اس عالم میں کسی کی بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ بدستور اپنی بات پر اڑے رہے۔ بحث کافی سنجیدہ اور طوالت اختیار کر گئی۔

حفیظ جالندھری نے پنڈت ہری چند اختر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اختر یار! تم بے چارے جوش کو نشے میں دیکھ کر ایک غلط بات اس سے منوا رہے ہو۔''

داغ دہلوی نے جو کہا ہے:

شکوی نہیں کسی کی ملاقات کی مجھے
تم جانتے ہو وہم ہے جس بات کی مجھے

حفیظ صاحب نے داغ کے شعر میں شکوہ کی جگہ شکوی اور دونوں مصرعوں میں کا کی جگہ کی کر دیا۔ اس پر ساری منڈلی ہنس پڑی اور جوش صاحب کھسیانے ہو کر چپ ہو رہے۔

قیام پاکستان سے پہلے کا ذکر ہے۔ دہلی میں ایک کل ہند طرحی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ طرح مصرع اختر انصاری دہلوی کا یہ مشہور مصرع تھا

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

اس طرح کو خاصا مشکل سمجھا جا رہا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس زمین میں اچھا شعر کہنا آسان نہیں۔ صدر مشاعرہ مولانا حسرت موہانی تھے۔ جب حفیظ جالندھری کا نام نامی پکارا گیا تو مولانا نے چونک کر حفیظ کی طرف دیکھا اور فرمایا ''حفیظ! تم بھی طرح پر کہہ کر لائے ہو۔''

حفیظ جھک کر آداب بجا لائے اور عرض کی ''حضور! کوشش کی ہے۔ پیش کرتا ہوں۔''

جب حفیظ نے غزل سنائی تو سماں بندھ گیا:

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

اسی غزل کا مشہور شعر ہے:

حفیظ اہل زبان کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

یہ غزل حاصلِ مشاعرہ قرار دی گئی۔

۱۹۶۹ء میں، بہ سلسلہ ملازمت میں چٹا گانگ میں تھا۔ غالب کی صد سالہ برسی کے حوالے سے ایک کُل پاکستان مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ سامعین کی سب سے اگلی صف میں نیوی کا ایک سینئر افسر اپنی بیگم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ جوڑا دیر سے کھُسر پھُسر میں مصروف تھا۔ کبھی کبھی بیگم ذرا بلند اور تلخ آواز میں کچھ کہنے لگتی۔ مشاعرے کا سکون غارت ہو رہا تھا۔ جب حفیظ صاحب مائیک پر آئے اور انھوں نے اپنے خاص ترنم میں غزل کی ابتدا کی:

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو، مری نیت خراب ہے

نیت کے لفظ پر، جیسا کہ ان کا خاص انداز تھا، رُک گئے اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر لیے سامعین کی طرف دیکھنے لگے۔ عین اسی لمحے وہ بیگم بھڑکی اور اپنے میاں پر ایک تند و تیز جملے کا وار کیا۔ حفیظ صاحب نے اپنا شعر وہیں چھوڑا اور باقاعدہ ہاتھ کے اشارے سے اس جوڑے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''اگر تمھیں محفل میں بیٹھنے کی تمیز نہیں ہے تو کیا کسی حکیم نے کہا تھا کہ مشاعرے میں ضرور آؤ۔'' یہ سنتے ہی بیگم کھٹ کھٹ کرتی ہال سے باہر چلی گئی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کا میاں آخر تک آرام سے وہیں بیٹھا رہا۔

اگر چہ چار پانچ مشاعروں میں انھیں سننے کا اتفاق ہوا تھا مگر حضرت حفیظ جالندھری سے میری بالمشافہ ملاقات ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ پاکستان بک کونسل لاہور کے زیر اہتمام میرے مجموعۂ کلام ''موج صدا'' کی تقریب رونمائی تھی۔ اس کے کرتا دھرتا سید قاسم محمود مرحوم تھے۔ پیر و مرشد سید ضمیر جعفری صاحب نے راولپنڈی سے حفیظ صاحب کو فون کیا کہ ہمارے عزیز دوست جمیل یوسف کے مجموعہ ء کلام ''موج صدا'' کی تقریب رونمائی لاہور میں ہو رہی ہے۔ آپ سے استدعا ہے کہ اس کی صدارت قبول فرمائیں۔

حفیظ صاحب نے فرمایا: ''ضمیر! مجھے اس کتاب کا ایک نسخہ بھیج دو۔ اسے دیکھوں گا اور پھر بتاؤں گا۔''

میں نے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک سید ضمیر جعفری کی طرف سے موج صدا کی ایک کاپی حضرت حفیظ صاحب کی خدمت میں ارسال کر دی۔ ایک ہفتے بعد سید ضمیر جعفری صاحب نے مجھے فون پر بتایا کہ حفیظ صاحب کا خط آیا ہے۔ انھوں نے تقریب کی صدارت قبول کر لی ہے۔ پھر خط پڑھ کر مجھے سُنایا ''اوئے ضمیر! مجھے اس شاعر جمیل یوسف کا کلام پسند آیا ہے۔ میری پسند کا معاملہ بہت اہم ہے خود میرے لیے۔''

جناب کرنل محمد خان، سید ضمیر جعفری اور راقم الحروف اکٹھے ایک ہی کار میں لاہور پہنچے۔ دوسرے دن شام ۵ بجے تقریب تھی۔ میں نے صبح دس بجے کے قریب حفیظ صاحب کو فون کیا۔ سلام و آداب کے بعد میں نے پوچھا۔ کیا میں آپ کو تقریب میں لے جانے کے لیے آؤں۔'' فرمانے لگے تقریب میں تو میں خود اپنی کار پر آ جاؤں گا۔ تم لوگ اس وقت کہاں ہو۔ ضمیر کہاں ہے۔ اُسے کہو مجھ سے بات کرے۔''

میں نے پیرو مرشد کی طرف فون کا ریسیور بڑھا دیا۔ حفیظ صاحب نے اُن سے کہا ''تم لوگ مجھے ملنے نہیں آ ؤ گے۔''

چنانچہ ہم تینوں کرنل محمد خان، سید ضمیر جعفری اور میں ماڈل ٹاؤن حفیظ صاحب کی کوٹھی پر جا پہنچے۔ گھنٹی بجانے پر خود حفیظ صاحب نے باہر نکل کر ہمارا استقبال کیا۔ میں نے احتراماً جھک کر ان کے پاؤں اور گھٹنوں کو چھونا چاہا مگر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اُوپر اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ بڑی شفقت کا اظہار کیا۔ ہم تینوں کو اپنے ساتھ اپنی خواب گاہ میں لے گئے۔ اس کمرے میں رسی سے بنی ہوئی ایک چار پائی پڑی تھی۔ فرش پر عام سی دری بچھی ہوئی تھی۔ حفیظ صاحب نے ہمیں اسی دری پر بیٹھنے کو کہا۔ خود بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ کرنل محمد خان چونکہ پینٹ کوٹ میں تھے۔ وہ چار پائی پر براجمان ہو گئے۔ میں نے دیکھا کمرے کے ایک کونے میں سٹوو پڑا تھا۔ جس پر ایک دیگچہ رکھا تھا۔ میں نے سٹوو اور دیگچے سے نگاہیں ہٹا کر سوالیہ نظروں سے سید ضمیر جعفری صاحب کی طرف دیکھا۔ انھوں نے بلا تکلف مجھے بتایا کہ دیکھو حفیظ صاحب نے اپنے کمرے میں ہی اپنا کچن بنایا ہوا ہے۔ اپنی ہانڈی خود پکاتے ہیں۔ اپنی چائے خود بناتے ہیں۔

میں حیرت سے یہ باتیں سن رہا تھا کہ حفیظ صاحب نے لپک کر دیگچہ اٹھایا اور واش روم سے اس میں چائے کے لیے پانی بھر لائے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے ہی ہمارے لیے چائے بننے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ حفیظ صاحب کے سامنے کرنل محمد خان اور سید ضمیر جعفری صاحب بڑے ادب سے خاموش بیٹھے ہیں۔ کرنل صاحب نے کہا بھی کہ جناب آپ تکلیف نہ

کریں۔ہمیں چائے کی کوئی حاجت نہیں۔مگر حفیظ صاحب اپنا سٹوو چلا چکے تھے۔انھوں نے وہیں کمرے کی دیوار میں نصب الماری کھولی اوراس میں سے چائے کی پتی اور چینی کا ڈبہ نکالا۔پھر اپنے کمرے سے باہر چلے گئے۔غالباً کچن سے ایک کپ میں دودھ لائے۔تھوڑی ہی دیر میں چائے بنا کر ہمیں پیش کی۔مجھے حیرت ہورہی تھی کہ حفیظ صاحب اتنے بڑے آدمی ہیں۔اتنی بڑی کوٹھی میں رہتے ہیں مگران کے پاس کوئی خادم نہیں ہے۔بعد میں واپسی پر راستے میں پیرومرشد سید ضمیر جعفری صاحب نے مجھے بتایا کہ حفیظ صاحب بڑے وہمی ہیں۔انھیں ہمیشہ یہ وہم رہتا ہے کہ کوئی انھیں زہر دے دے گا۔نہ کسی نوکر پر اعتبار کرتے ہیں اور نہ بیوی پر۔اپنا کھانا خود پکاتے ہیں۔اسی دری پر بیٹھ کر کھانا وغیرہ پکانے اور لکھنے پڑھنے کا سارا کام کرتے ہیں۔

میں نے حفیظ صاحب سے پوچھا کہ پروفیسر احمد شاہ بخاری نے فرمایا تھا کہ حفیظ کے شعروں سے محسوس ہوتا ہے کہ مصرعے کہے نہیں گئے بلکہ ٹپک پڑے ہیں آپ کے ہاں جو بے پناہ سلاست روانی اور بہاؤ ہے اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ شعر آپ پر نازل ہوتے ہیں۔ڈھلے ڈھلائے اور بنے بنائے مصرعے آپ کی نوک قلم سے ٹپک پڑتے ہیں؟''

حفیظ صاحب نے مسکرا کے میری طرف دیکھا اور پھر لمحہ بھر دیکھتے رہنے کے بعد فرمایا۔''میں ابھی تمھیں دکھاتا ہوں مصرعے کس طرح ٹپکتے ہیں۔یہ کہہ کر وہ اٹھے،الماری کھولی، وہی الماری جس میں سے انھوں نے چائے کی پتی اور چینی برآمد کی تھی۔اب کے اس میں سے ایک پرانی بوسیدہ سی کاپی نکال لائے اور میرے ہاتھ میں دے کر کہنے لگے''اسے کھول کر دیکھو۔تمھیں پتہ چل جائے گا۔شعر اور مصرعے کس طرح ٹپکتے ہیں۔میں نے کاپی کھولی۔سید ضمیر جعفری صاحب نے فرمایا۔یہ حفیظ صاحب کی بیاض ہے۔جو صفحہ سامنے آیا ہوا تھا اس میں دو تین مصرعوں کے مختلف لفظوں کو کاٹ کاٹ کر انھیں تبدیل کیا گیا تھا۔مزید ورق گردانی سے پتہ چلا کہ کئی لفظوں کو ایک بار نہیں بلکہ متعدد بار تبدیل کر کے لکھا ہے اوراس طرح مصرعے نئی نئی صورتیں اختیار کرتے گئے ہیں۔ سید ضمیر جعفری کہنے لگے۔''حفیظ صاحب تو ایک ایک لفظ پر چوکی ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں۔''

حفیظ صاحب نے کہا۔ ''شاعری بڑی محنت اور جگر کاوی مانگتی ہے۔

برائے پائی لفظے شبے بروز آرد

کہ مرغ و ماہی باشند خفتہ، او بیدار

میں نے عرض کیا۔ ''جناب عالیٰ! میرے لیے یہ ماننا مشکل ہے کہ آپ نے اپنے ہزاروں اشعار پر مشتمل کلام کے ہر مصرعے اور ان کے الفاظ پر اتنی محنت کی ہے۔ صرف محنت سے کلام کا اتنا بڑا ذخیرہ کہاں جمع ہوسکتا ہے۔ مجھے تو یہ آمد بلکہ بے بہا آمد کا کرشمہ لگتا ہے۔''

سید ضمیر جعفری صاحب نے فرمایا۔ ''جمیل! تم ٹھیک کہتے ہو۔ انھیں آمد ہوتی ہے مگر جب تک یہ ہر لفظ کو چھان پھٹک کر دیکھ نہ لیں مطمئن نہیں ہوتے۔''

حفیظ صاحب نے فرمایا: ''میں اپنی شعر گوئی سے متعلق ایک شعر سناتا ہوں۔''

حفیظ اپنی ترقی شعر میں یہ ہے کہ اس فن کو

بہت آساں سمجھتے تھے، بہت مشکل سمجھتے ہیں

کرنل محمد خان جو اس وقت تک خاموش بیٹھے ہماری باتیں سُن رہے تھے۔ حفیظ صاحب سے کہنے لگے۔ ''حفیظ صاحب خوش قسمتی سے آپ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا ہے۔ مہربانی فرما کر اپنے مخصوص ترنم میں شاہ نامہ اسلام کے کچھ اشعار عطا فرمائیں۔''

حفیظ صاحب کہنے لگے۔ ''کرنل صاحب! اب وہ ترنم کہاں۔ بہرحال آپ کے ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں۔''

حفیظ صاحب نے الماری سے شاہ نامہ اسلام کی پہلی جلد نکالی اور شروع کے چند صفحات کی ورق گردانی کرنے کے بعد یہ نعتیہ اشعار نہایت دلپذیر آواز میں سنائے:

محمد مصطفیؐ ، محبوبؐ داور ، سرورؐ عالم

وہ جس کے دم سے مسجود ملائک بن گیا آدم

وہ نورِ لم یزل جو باعثِ تخلیق آدم ہے

خدا کے بعد جس کا اسمِ اعظم، اسم اعظم ہے
وہ جس کا ذکر ہوتا ہے زمینوں آسمانوں میں
فرشتوں کی دعاؤں میں مؤذّن کی اذانوں میں
وہ جس کے معجزے نے نظم ہستی کو سنوارا ہے
جو بے یاروں کا یار، بے سہاروں کا سہارا ہے
وہ جس نے تخت اُوندھے کر دیے شاہان جابر کے
بڑھائے مرتبے دنیا میں ہر انسانِ صابر کے
غلاموں کو شہنشاہی کے قابل کر دیا جس نے
غرورِ نسل کا افسوں باطل کر دیا جس نے

حفیظ صاحب نے ہماری محویت دیکھ کر اور ازراہِ کرم ہمیں شاہ نامہ اسلام کے کئی اور اشعار بھی سنائے۔ میں نے جسارت کرتے ہوئے عرض کیا۔ جناب عالیٰ! میری خواہش ہے کہ ''صحرا کی دعا'' کے کچھ اشعار عطا کریں۔ میں اسے شاہ نامہ کا اعلیٰ ترین شعر پارہ سمجھتا ہوں۔ میری بات سن کر خوش ہوئے اور فرمایا ''تلوک چند محروم بھی مجھ سے یہی کہتا تھا کہ یہ نظم اسے بہت زیادہ پسند ہے۔ ''صحرا کی دعا'' نے حفیظ صاحب کی آواز میں عجیب سماں باندھ دیا۔

یہ تشنہ لب جماعت جب یہاں پر رک گئی آ کر
دعا کی دامنِ صحرا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر
کہ اے صحرا کو آتشناک چہرہ بخشنے والے
رخِ خورشید کو کرنوں کا سہرہ بخشنے والے
ازل کے دن سے اب تک بھاڑ میں بُھنتا رہا ہوں میں
صدائے ابر باراں دور سے سنتا رہا ہوں میں
میں سمجھا تھا مقدر ہو چکی ہے، دھوپ کی سختی

مری قسمت میں لکھی جاچکی ہے، سوختہ بختی
بنایا رفتہ رفتہ سخت میں نے بھی مزاج اپنا
لیا ہر آبلہ پا سے زبردستی خراج اپنا
خبر کیا تھی الٰہی ایک دن ایسا بھی آئے گا
کہ تیرا ساقیء کوثر یہاں تشریف لائے گا
خبر کیا تھی ملے گی یہ سعادت میرے دامن کو
بنایا جائے گا فرشِ عبادت میرے دامن کو
مرے سر پر سے گزرا نوح کے طوفان کا پانی
تآسف ہے کہ مجھ سے ہوگئی اُس وقت نادانی
اگر کرتا میں اُس پانی کی تھوڑی سی نگہ داری
تو ہوجاتا مری آنکھوں سے چشموں کی طرح جاری
یہ ستر اونٹ، دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے
مجاہد بھی وضو کرتے، نہاتے، غسل فرماتے
خبر ہوتی تو میں شبنم کے قطرے جمع کر رکھتا
چھپا کر ایک گوشے میں مصفا حوض بھر رکھتا
وہ پانی ان مقدس میہمانوں کو پلا دیتا
میں اپنی تشنگی دیدارِ حضرت سے بجھا لیتا
حضور ساقیء کوثر مری کچھ لاج رہ جاتی
مری عزت مری شرم عقیدت آج رہ جاتی
ترے محبوب کے پیارے قدم اس خاک پر آئے
الٰہی حکم دے سورج کو اب آتش نہ برسائے

اگر اب میرے دامن سے ہوائے گرم آئے گی
تو مجھ کو رحمۃ اللعالمینؐ سے شرم آئے گی

کچھ دیر ہم اس طلسمی فضا میں سانس لیتے رہے۔ محویت کا عالم چھایا رہا۔ حفیظ صاحب بھی چپ ہو گئے۔ ایک سوز و گداز کی کیفیت تھی۔ جس نے ہم سب کو حفیظ صاحب سمیت اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے زبان کھولی۔ حفیظ صاحب سے مخاطب ہو کر عرض کیا: مجھے یہ نظم ۱۹۵۲ء سے یاد ہے۔ جب میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مجھے اس وقت شاہ نامہ اسلام کے سینکڑوں اشعار زبانی یاد ہو گئے تھے۔ اب تک یاد ہیں۔

کچھ دیر بعد ہم نے محترم حضرت حفیظ سے اجازت چاہی۔ رخصت کرتے وقت انھوں نے فرمایا۔ میں تقریب میں صحیح وقت پر پہنچ جاؤں گا۔

واپسی پر راستے میں ہم کچھ دیر تو اُسی کیف و سرور میں رہے جس میں کلام حفیظ نے ہمیں پہنچا دیا تھا۔ پھر سید ضمیر جعفری کہنے لگے۔ شاہ نامہ اسلام ایک زندہ رہنے والی کتاب ہے۔ اس کے اشعار جب بھی سنتے ہیں یا پڑھتے ہیں، ذہن و دل پر ایک کیفیت طاری ہو گئی ہے۔

باتوں باتوں میں کئی موضوعات سامنے آئے۔ میں نے کہا: ''حفیظ صاحب اس قدر سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کمرے میں بس ایک عام سی چار پائی اور ایک پرانی سی دری پڑی ہے اور ایک سٹوو۔ یہ ان کی کل کائنات ہے حالانکہ انھیں تو بڑا دولت مند ہونا چاہیے۔ زندگی میں اتنی بڑی بڑی تنخواہیں بھی لیں۔ پھر ان کو اپنی کتابوں سے بھی کچھ کم آمدنی نہیں ہوئی۔ صرف شاہ نامہ اسلام کی ہی کئی لاکھ جلدیں بک چکی ہیں۔''

کرنل محمد خان صاحب فرمانے لگے: ''سنا ہے حفیظ صاحب بے حد کنجوس ہیں۔''

جعفری صاحب جنھوں نے کئی سال جناب حفیظ صاحب کے ساتھ گزارے تھے گویا ہوئے اور فرمایا: ''یہ سچ ہے حفیظ صاحب انتہائی کنجوس ہیں مگر اپنی ذات کے لیے۔ اپنے غریب

رشتہ داروں اور دوسرے محتاجوں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ کئی نادار خاندانوں کا گزارہ ان کے سہارے چل رہا ہے۔''

کرنل صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''اچھا۔ یہ بات ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات آپ نے سنائی۔ اکثر کنجوس آدمی اپنے اوپر پھر بھی تھوڑا بہت خرچ کر دیتے ہیں مگر ان کی اصل کنجوسی کا اظہار دوسروں پر ہوتا ہے۔''

سید ضمیر جعفری صاحب نے بتایا: ''ان کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔''

باتوں باتوں میں، میں نے پیرومرشد سے پوچھا: ''ان کے بیوی بچے نظر نہیں آئے۔ کیا کسی کو خیال نہیں آیا کہ حفیظ صاحب کے پاس مہمان آئے ہیں ان کے لیے چائے بنا کر لے آؤں۔ تاکہ حفیظ صاحب کو خود زحمت نہ کرنا پڑے۔''

جعفری صاحب نے بتایا: ''حفیظ صاحب اہل خانہ میں سے کسی کو اپنے کمرے میں گھسنے ہی نہیں دیتے۔ میرا خیال ہے گھر والوں سے ان کی بات چیت کم ہی ہوتی ہے۔ اس وقت ان کی تیسری اور اکلوتی بیوی خورشید اور اس کی بیٹی رضا، ان کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ مگر یہ اپنی ہانڈی روٹی خود ہی کرتے ہیں۔ نہ کسی کو برداشت کرتے ہیں، نہ کسی پر اعتبار کرتے ہیں۔''

پھر جعفری صاحب نے فرمایا: ''آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناؤں۔ چند ماہ قبل حفیظ صاحب نے ایک پڑھے لکھے نوجوان کو ملازم رکھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ ہر روز تین چار گھنٹے کے لیے آتا تھا اور حفیظ صاحب کے پاس بیٹھ کر ان سے ڈکٹیشن لیتا تھا۔ یہ اس کو اپنی سوانح عمری لکھوا رہے تھے۔ ابھی اس کام کو چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک دن اس نوجوان کی موجودگی میں حفیظ صاحب نے اپنی بیگم کو آواز دی۔ میری دوا کی فلاں شیشی بھجوا دو۔ بیگم تک غالباً آواز نہیں پہنچی یا وہ کسی اور کام میں مصروف تھیں۔ حفیظ نے پھر بہ آواز بلند ان کو دوا بھجوانے کے لیے پُکارا۔ اس پر اس نوجوان نے کہا ''اگر آپ اجازت دیں تو میں دوا اُٹھا لاؤں۔'' اس پر حفیظ صاحب نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا ''تمھیں کیسے پتہ ہے کہ دوا کہاں رکھی ہے۔ اس کا مطلب ہے تم میری

غیر موجودگی میں گھر کے اندر پھرتے رہتے ہو۔ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ پھر ادھر کا رُخ نہ کرنا۔''

اس طرح سوانح عمری کا منصوبہ بھی دھرا کا دھرا رہ گیا۔

میری کتاب کی تقریب رونمائی کی صدارت چونکہ حضرت حفیظ جالندھری جیسی اہم ادبی شخصیت نے کرنی تھی ۔ اس لیے ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے اس تقریب میں شرکت کے لیے جناب احمد ندیم قاسمی اپنے احباب کے ساتھ تشریف لائے تھے۔

تقریب کے اختتام پر چائے کی میز پر جناب سید ضمیر جعفری نے میرا تعارف جناب مرزا محمد منوّر سے کرایا۔ پروفیسر صاحب اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں صدر شعبہء عربی تھے اور حفیظ صاحب کے خاص دوستوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پروفیسر صاحب مجھے بڑی شفقت اور محبت سے ملے۔ حفیظ صاحب جب اپنی کار میں بیٹھ کر تشریف لے جا چکے تو پروفیسر مرزا محمد منوّر صاحب نے مجھ سے اور سید ضمیر جعفری صاحب سے کہا کہ چائے کچھ بے مزہ سی تھی۔ چلیں شیزان میں بیٹھ کر چائے کا نشہ پورا کرتے ہیں۔ کرنل محمد خان بھی ہمیشہ سے اچھی چائے کے بڑے رسیا تھے۔ چنانچہ ہم چاروں شیزان جا پہنچے اور دیر تک حفیظ صاحب کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے بطور خاص پروفیسر صاحب سے پوچھا کہ حفیظ صاحب کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ بڑے کنجوس ہیں۔ پروفیسر صاحب کہنے لگے۔ ''وہ اسراف کے سخت خلاف ہیں۔ نہایت سادہ اور درویشانہ زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ انھیں کوئی فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لا دے تو وہ اُسے بیچ کر تھرڈ کلاس میں جا بیٹھیں گے مگر یہ بات قابل ذکر ہے کہ محتاجوں اور ناداروں کی امداد کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کئی خاندانوں کو ہر ماہ باقاعدگی سے پیسے بھیجتے ہیں۔''

میں جب سرگودھا میں تعینات تھا۔ گاہے بگاہے درِ دولت پر حاضری دیتا۔ ایک دفعہ سرگودھا سے میں نے انھیں فون کیا کہ میں لاہور آرہا ہوں۔ آپ کے لیے کیا لاؤں۔ کینوؤں کی پیٹی لیتا آؤں۔ حفیظ صاحب نے فرمایا۔ ''کینو کو رہنے دو۔ مجھے خالص دیسی گھی لا دو۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ بڑے خوش ہوئے۔ میں موقع بہ موقع دیسی گھی کا تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرتا

رہا۔ایک دفعہ شام کوان کی کوٹھی پر پہنچا تو باہر گیٹ پر ہی مل گئے۔کچھ پریشان سے لگ رہے تھے۔ میرے استفسار پر فرمانے لگے۔''جمیل۔میرا ڈرائیور کار لے کر بھاگ گیا ہے۔اسے ایک کام پر بھیجا تھا۔چار بجے تک اُسے واپس آ جانا چاہیے تھا۔اب چھ ہونے والے ہیں ابھی تک نہیں لوٹا۔''

میں نے عرض کیا۔''جناب! یہ تو کوئی تشویش کی بات نہیں۔آ جائے گا۔کہیں گاڑی کا پنکچر وغیرہ لگوانے ٹھہر گیا ہوگا۔'' کہنے لگے''تم نہیں جانتے۔یہ بڑا حرامزادہ ہے۔میں اُسے اکیلے نہیں جانے دیتا۔مجھے یہی خدشہ رہتا ہے کہ کہیں گاڑی لے کے غائب نہ ہو جائے۔آج اس کو موقع مل گیا اور وہ رفو چکر ہو گیا ہے'' حفیظ صاحب کی زبان سے یہ فقرہ بمشکل ادا ہی ہوا تھا کہ دور سے ان کی کار آتی ہوئی نظر آ گئی۔ان کی پریشانی فوراً غائب ہو گئی۔کہنے لگے۔شکر ہے گاڑی واپس آ گئی ہے۔''جمیل! تم مجھے کوئی قابل اعتماد ڈرائیور لا دو۔مجھے اس پر اعتبار نہیں۔''

حفیظ صاحب سے میری آخری ملاقات ۱۹۸۱ء میں ہوئی۔غالباً نومبر کے آخری دن تھے۔میں صبح نو بجے کے قریب کنٹونمنٹ پبلک لائبریری راولپنڈی میں جناب عزیز ملک کے پاس گیا جو وہاں لائبریرین تھے۔کیا دیکھتا ہوں کہ ان کے پاس حفیظ صاحب تشریف فرما ہیں۔ میں اشتیاق سے ان کی طرف لپکا۔

حفیظ صاحب مجھے خاصے نحیف ونزار لگ رہے تھے۔مجھے ملنے کے لیے انھوں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے انھیں اس زحمت سے بچانے کے لیے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ بڑے پیار اور محبت سے ملے۔فرمانے لگے۔''اچھا ہوا۔تم آ گئے ہو۔تمھارے پاس کار تو ہوگی۔ مجھے ایئر پورٹ چھوڑ آؤ۔میں عزیز ملک سے کہہ ہی رہا تھا کہ ٹیکسی منگواؤ۔''

عزیز ملک صاحب نے مجھے بتایا کہ حفیظ صاحب دو دن سے پنڈی میں ہی ہیں اور انہی کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔انھوں نے لاہور سے صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کو فون کیا تھا کہ''آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''صدر نے ان سے کہا''جب چاہیں،تشریف لے آئیں۔''یہ اب پچھلے دو دن سے صدر سے ملاقات کی ناکام کوششوں میں مصروف ہیں۔جب اُن سے ملنے جاتے

ہیں گیٹ پر استقبالیہ سٹاف انھیں بتا تا ہے کہ صدر صاحب اس وقت بڑے مصروف ہیں۔ ملاقات ممکن نہیں۔ کل رابطہ کریں۔ فون پر ان سے بات نہیں ہو رہی۔ اب یہ اکتا چکے ہیں اور کہتے ہیں ''میں واپس جا تا ہوں۔''

میں نے عرض کیا۔'' واپس جاتے ہوئے ایک دفعہ پھر ایوان صدر پر دستک دیتے جاتے ہیں۔ حفیظ صاحب کہنے لگے۔نہیں، میں اب اس سے ملنا ہی نہیں چاہتا۔ اسے چاہیے تھا مجھ سے بات کرنے کے بعد اپنے استقبالیہ دفتر کو میرے بارے میں آگاہ کرتا۔ کہ جب آؤں۔ ملاقات کروائیں۔''

بہر حال تھوڑی دیر کے بعد عزیز ملک صاحب اور میں حفیظ صاحب کو لے کر ایئر پورٹ کی طرف چل پڑے۔ راستے میں حفیظ صاحب سے عرض کیا کہ حضور آپ اتنے دور سے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ کیا حرج ہے ایک دفعہ اور صدر سے ملنے کی کوشش کر دیکھیں۔ ایوانِ صدر راستے میں ہی تو پڑتا ہے۔'' حفیظ صاحب تھوڑی سی ردو کد کے بعد مان گئے۔ اور ہم ایوان صدر کے گیٹ کے باہر استقبالیہ دفتر کے سامنے جا کرُ رکے۔ میں نے گاڑی سے نکل کر استقبالیہ میں بیٹھے ہوئے ایک کرنل صاحب سے بات کی۔ اس نے بتایا کہ جن وی آئی پیز (VIPs) کی ملاقات کا وقت پہلے سے مقرر ہے انھیں اندر جانے کی اجازت ہے۔ میں نے کہا آپ صدر صاحب کو یہ بتا تو دیں کہ حفیظ جالندھری صاحب آپ کے کہنے کے مطابق لاہور سے آپ کو ملنے کے لیے آئے ہیں مگر کرنل صاحب نے کہا جناب ہمیں اس طرح کا کوئی پیغام اندر بھجوانے کی اجازت ہی نہیں۔

اس پر میں نے اس کے سامنے پڑی ہوئی وزیٹرز بک اُٹھائی اور حفیظ صاحب کے پاس لے گیا۔ ان سے عرض کی جناب آپ وزیٹرز بک میں اپنی آمد تو ڈال دیں۔ کم از کم بعد میں صدر صاحب سے بات ہو تو یہ تو کہا جا سکے کہ آپ کے دروازے پر دستک دی ہے۔''

حفیظ صاحب گویا ہوئے'' کیا ایک دفعہ دستک دی ہے۔ یہ آج میرا تیسرا پھیرا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے وزیٹرز بک میرے ہاتھ سے لی۔ اپنی جیب سے قلم نکالا اور بڑے بڑے حروف

میں لکھا ''ضیا! میں تمھارے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ بار بار تمھارے گھر کے چکر لگاتا رہوں۔ حفیظ۔''

میں نے وزیٹرز بک بند کی۔ کرنل کی میز پر جا کر رکھی اور یہ جا وہ جا۔ ہم ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ عزیز ملک صاحب نے کہا۔ ''حفیظ صاحب آپ نے فقرہ کچھ زیادہ تیز لکھ دیا ہے۔ آخر وہ ملک کا صدر ہے۔'' حفیظ صاحب نے کہا ''وہ ملک کا صدر ہی نہیں۔ میرا گرائیں بھی ہے۔ جالندھری ہے۔''

خیر ہم ایئر پورٹ جا کر اور حفیظ صاحب کا ٹکٹ بنوا کر انھیں لاہور کے جہاز پر بٹھا آئے۔ اگلے دن مجھے عزیز ملک صاحب نے بتایا کہ اُسی دن شام پانچ بجے کور کمانڈر لاہور کی گاڑی حفیظ صاحب کے گھر پہنچ گئی کہ چلیے آپ کو صدر صاحب یاد کر رہے ہیں۔ ساڑھے چھ بجے والے جہاز پر آپ کی سیٹ بک کرا دی گئی ہے۔ اب کے جو حفیظ صاحب اسلام آباد ایئر پورٹ پر اُترے تو آگے ایوان صدر کی گاڑی ان کے انتظار میں کھڑی تھی۔

۱۹۸۲ء کے سال کے دوران عزیز ملک صاحب اور پیرومرشد سید ضمیر جعفری صاحب سے اکثر یہ سننے میں آتا رہا کہ حفیظ صاحب علیل ہیں۔ میں ان کی عیادت کو جانے کے ارادے باندھتا رہا۔ مگر کسی نہ کسی وجہ سے پروگرام مؤخر ہوتا رہا۔ پھر میری تبادلہ کوئٹہ ہوگیا تو ان کی خدمت میں حاضر ہونا اور مشکل ہوگیا۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء کو یہ الم ناک خبر سنی کہ حفیظ خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ پہلے انھیں امانتاً ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں دفن کیا گیا پھر جب مینار پاکستان کے زیرِ سایہ ان کے مزار کی تجویز منظور ہوئی تو انھیں وہاں ابدی نیند سلا دیا گیا۔ شاعر پاکستان مینار پاکستان کے سائے میں محوِ خواب ہوئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

☆☆............☆☆

شاہ نامہ اسلام

اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اُردو شاعری کی کوئی کتاب اتنی زیادہ تعداد میں فروخت نہیں ہوئی جتنی زیادہ تعداد میں حفیظ جالندھری کی غیر فانی اور زندہ ء جاوید تصنیف ''شاہ نامہ اسلام'' فروخت ہوئی ہے۔ تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ جناب محمد طفیل مدیر نقوش نے حفیظ پر اپنی کتاب ''مخدومی'' میں لکھا ہے کہ اب تک (اور یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں لکھی گئی ہے) شاہ نامہ اسلام کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ اوسط درجے کے پڑھے لکھے تمام مسلمانوں کے گھروں میں جنھوں نے کبھی کوئی شعری مجموعہ نہیں خریدا، شاہ نامہ اسلام کی کوئی نہ کوئی جلد مل جاتی ہے۔ جسے وہ یا ان کے باپ دادا صبح صبح قرآن مجید کی تلاوت کے بعد کارِ ثواب سمجھ کے پڑھتے چلے آئے ہیں۔

۱۹۵۰ء کے عشرے تک مسلمان گھروں میں جہاں بیٹیوں کو جہیز میں قرآن حکیم کے نسخے کے ساتھ بہشتی زیور دینے کا رواج تھا وہاں شاہ نامہ اسلام کی جلدیں بھی دی جاتی رہی ہیں۔ جن دنوں حفیظ جالندھری ہزاروں سامعین کے جلسوں میں اپنی جادو بھری آواز میں شاہ نامہ اسلام پڑھ کر سنایا اور لوگوں کو رُلایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تو شاہ نامہ اسلام کے نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوا کرتے تھے۔ میرے والد محترم ریاضی کے اُستاد تھے اور شعر و شاعری کے خلاف تھے۔ شاعروں کے بارے میں حالی کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے

گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

جب میں ساتویں جماعت میں تھا اور نصابی کتابوں میں موجود نظموں کے شعری آہنگ نے مجھے جکڑ رکھا تھا، میں نے ایک دن اپنے ابا جی سے پوچھا کہ کیا ایسی کتابیں بھی ہوتی ہیں جو

ازاوّل تا آخر نظموں پر مشتمل ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ ایسی بہت سی کتابیں ہیں۔ شعری مجموعوں سے کتب خانے بھرے پڑے ہیں۔ میں نے ان سے التجا کی کہ مجھے کوئی شعری مجموعہ لا دیں۔ اس پر وہ سوچ میں پڑ گئے۔ منہ سے کچھ نہ بولے۔ غالباً سوچ رہے ہوں گے کہ بیٹا کس مرض میں مبتلا ہو گیا ہے۔ مگر شام کو میں کیا دیکھتا ہوں کہ بازار سے واپسی پر ایک کتاب ان کے ہاتھ میں ہے۔ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے۔ ''جمیل! نظموں کی یہ کتاب تمھارے لیے لایا ہوں۔''

میں نے بڑے اشتیاق سے کتاب پر نظر ڈالی۔ یہ شاہ نامہ اسلام کی جلد اوّل تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے والد صاحب شاعری کے تو خلاف تھے مگر شاہ نامہ اسلام کو میرے لیے مفید سمجھ کر خرید لائے تھے۔ مجھے یاد ہے میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ اس وقت اُردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے تو انھوں نے فرمایا تھا ''حفیظ جالندھری''۔ یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کا ہے۔ میرے والد صاحب نے حالی اور اقبال کے علاوہ کم ہی کسی شاعر کا کلام پڑھا تھا۔

اب ذرا شاہ نامہ اسلام کے بارے میں محمد طفیل صاحب کے تاثرات ملاحظہ ہوں:

> ''کوئی شاعری میں (شاہ نامہ اسلام کو) اونچا درجہ نہ دے مگر یہ کام زندہ ضرور رہے گا۔ مستقبل پر کمندیں ڈالنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی عظیم ذہن کارفرما ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں انھیں (حفیظ صاحب کو) شاعروں میں شاعر نہیں بلکہ شاعروں میں پیغمبر سمجھتا ہوں۔'' (مخدومی صفحہ ۱۰۲)

اس دور میں اگر کوئی یہ کہے کہ چند ایسی نظموں کے نام لیجیے جنھیں قبولیت خواص وعوام حاصل ہوئی تو ان میں مولانا حالی کی مسدس، اقبال کا شکوہ جواب شکوہ اور حفیظ کا شاہ نامہ ہی ذہن میں آئیں گے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ شاہ نامہ اسلام کو منظوم کتاب کم، مقدس کتاب زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ ہوگی جو صبح قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوں اور رات کو شاہ نامہ اسلام پڑھتے ہوں۔

مسجدوں میں یہ پڑھا جائے، مولویوں میں یہ پڑھا جائے۔ شہروں میں یہ پڑھا جائے۔ دیہاتوں میں یہ پڑھا جائے۔ یہ واقعہ ہے کہ اُردو میں اس سے زیادہ مقبول کسی اور شاعر کا کلام نہیں۔

ایک سفید ریش ان کی کوٹھی پر آئے۔ انھوں نے آ کر ان کے ایک عزیز سے کہا ''حفیظ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔'' انھیں اطلاع ہوئی تو باہر آئے اور اس بزرگ سے مخاطب ہو کر کہا: ''فرمایے۔''

''میں حفیظ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''فرمایے کیا حکم ہے؟''

بزرگ سفید ریش نے انھیں حفیظ جالندھری نہ سمجھتے ہوئے پھر کہا۔ ''میں حفیظ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

انھوں نے کہا ''میں ہی ہوں۔''

''نہیں نہیں۔'' وہ بولے۔

حفیظ صاحب نے اندازہ لگا لیا کہ بزرگ کسی ایسی ہستی کو حفیظ جالندھری کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں جو ان کے خیالوں میں بسی ہوئی تھی۔ ایک نورانی ہیولا۔ یہ جب انھیں عام سے آدمی لگے تو انھوں نے انھیں حفیظ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس تذبذب کی کیفیت کا اندازہ کر کے اور اس بزرگ کے دل میں اپنے لیے اتھاہ محبت کا خیال کرتے ہوئے، حفیظ صاحب رو پڑے۔ اس بزرگ کے قدموں میں گر پڑے۔

بابا، جسے آپ ملنے آئے ہیں وہ بندہء ناچیز میں ہی ہوں۔''

تعارف کی یہ رسم عجیب تھی۔ وہ ان کے گلے سے لپٹ کر روتے رہے۔ یہ ان کے گلے سے لپٹ کر روتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو سنبھال کر حفیظ صاحب نے کہا:

''بزرگو! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''

''پشاور سے''

''کیسے آئے؟''

''پیدل''(سوال کچھ تھا، جواب کچھ)

''پیدل کیوں''

''وہ اس خیال سے کہ آپ کی خدمت میں یوں حاضر ہونا میری نجات کا باعث بن جائے گا۔''

''نجات کا باعث''

''جی ہاں۔ میں تو صرف آپ کی زبان مبارک سے شاہنامہ اسلام سننے آیا ہوں۔''

جب یہ شاہنامہ اسلام سنا رہے تھے تو اُن پر عجب جذب و کیف کا عالم تھا۔ کبھی کبھی تڑپ کر اللہ اکبر کا نعرہ بھی بلند کرتے۔ جب یہ پڑھ چکے تو وہ بزرگ اُٹھے اور چل دیے۔ انھوں نے التجا کی۔''ذرا تو رُکیے''

''اب نہیں''

''کیوں''

''میری تمنا پوری ہوگئی۔''

ماہ نامہ افکار کے حفیظ نمبر میں جناب جمیل الدین عالی رقم طراز ہیں:

''اس کٹے پھٹے غریب مگر میرے لیے محفوظ پاکستان کے حصول کے لیے حفیظ صاحب نے اپنی بساط بھر کام کیا تھا۔ مثلاً وہ مسلم لیگ کے بڑے بڑے جلسوں میں، ناخواندہ مگر آزادی کے آرزومند مسلم عوام کے دل شاہ نامہ اسلام سے گرماتے تھے۔ میلاد کی بڑی بڑی تقریبات میں سلام پڑھتے تھے اور جن سرکاری اور سیاسی حلقوں اور مجلسوں تک ان کی پہنچ تھی وہاں پاکستان ہی کی بات کرتے تھے۔ ان کی قومی نظموں، نعتوں اور سلاموں کی مستقل ادبی حیثیت الگ متعین ہوتی رہے گی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان کی وقتی افادیت بھرپور تھی۔ ایک تحریک ایک بہت بڑے

انجن کی طرح ہوتی ہے۔ جس میں ہزاروں چھوٹے بڑے پُرزے ہوتے ہیں۔ آج ہمارے ملک میں ایسے کتنے جانے پہچانے ادیب رہ گئے ہیں جو بیک وقت اچھے شاعر بھی ہوں اور جنھوں نے اپنے ملک کی تعمیر میں کوئی مثبت اور مؤثر کردار بھی ادا کیا ہو۔

میں دو باتیں ضرور جانتا ہوں۔ ایک اُردو زبان اور دوسرے حصول پاکستان کی تاریخ اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ حفیظ صاحب نے ان دونوں شعبوں میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ حفیظ صاحب ہمارے اکابرین اولین میں شامل ہیں۔'' (ماہ نامہ افکار ''حفیظ نمبر'' صفحہ ۲۳، ۲۴)

شاہ نامہ اسلام کے بارے میں شیخ سر عبدالقادر لکھتے ہیں:

'' کامیابی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ شاہ نامہ اسلام کو خدا نے ہر طرح سے کامیابی دی۔ کتاب اگر مقبول ہو اور بکثرت اشاعت پائے تو یہ اس کی پہلی اور سب سے بڑی فتح ہے۔ اس کی خوبی کا دوسرا ثبوت یہ ملا کہ قرون اولیٰ کے پسران اسلام کے کارناموں کو نظم کا لباس پہنانے کی جو طرز حضرت حفیظ نے اختیار کی تھی اس کی تقلید جابجا ہونے لگی۔ اور کئی اور لکھنے والوں نے اسی طرز پر اسلامی نظمیں شائع کیں۔ قبول عام اس تصنیف کو اس قدر حاصل ہوا کہ قومی مجالس میں جب کسی نے اُسے پڑھ کر سنایا تو لوگوں نے انتہائی توجہ اور شوق سے سُنا اور جہاں کہیں لوگوں کو خود مصنف کی زبان سے شاہ نامہ اسلام کے کچھ حصے سُننے کا موقعہ ملا وہاں تو محویت طاری ہوگئی۔

مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ جو روایات نظم کی جائیں وہ ایسی ہوں جن کی صحت تاریخی اعتبار سے مسلمہ ہو۔ جابجا ایسے نوٹ دیے گئے ہیں جن سے روایات کے ماخذ کا پتہ چلتا ہے۔ اس احتیاط کے متعلق کچھ اشعار

عرضِ مصنف کے نام سے درج کتاب ہیں۔ مصنف نے کیا خوب کہا ہے:

مجھے ملحوظ ہے اس تذکرے میں راست گفتاری
وگرنہ شاہباز فکر اڑنے سے نہیں عاری
جو موضوعِ سخن مجھ کو اجازت اک ذرا دیتا
زمینوں کو اٹھا کر آسمانوں پر بٹھا دیتا
مجھے گُر یاد ہیں قطرے کو طوفاں کر دکھانے کے
کسی ذرے کو وسعت میں بیاباں کر دکھانے کے
نہ ہے یہ ژال کا قصہ، نہ رستم کی کہانی ہے
پرِ سیمرغ ہے اس میں نہ راہ ہفت خوانی ہے
تخیل پر نہیں بنیاد میر یشاہ نامے کی
صداقت کی طرف جاتی ہے رہ راست خامے کی
نہ کوئی داستاں ہے جس میں لطفِ داستاں بھر دوں
نہ افسانہ ہے جس کو جس طرح چاہوں بیاں کر دوں

ممکن ہے مندرجہ بالا توضیح سے کوئی یہ سمجھے کہ کتاب نظم کے اعتبار سے روکھی پھیکی ہوگی اور جو حالات لکھے ہیں، ان کی تصویر اگر بمطابق اصل ہے تو اس میں مصور کو رنگ بھرنے کا بھلا کیا موقعہ ملا ہوگا۔ مگر طبعِ رنگیں اپنے لیے راستہ نکالے بغیر کہاں رہ سکتی ہے۔ سیدھی سادی روایتوں کے منظوم بیان میں حفیظ کی شاعری نے اپنی خصوصیات کے اظہار کے لیے جگہ جگہ گنجائش نکال لی ہے۔ اور ایسے ادبی جواہر پیش کیے گئے ہیں جنھیں شائقین پسند کریں گے اور مزے لے لے کر پڑھیں گے۔ مثلاً جنگ بدر کا بیاں ہے کہ جہاں جناب رسالتمآبؐ کا چھوٹا سا لشکر ایک ریگستانِ بے آب

میں پانی کی تلاش میں ہے۔اس وقت حسنِ اتفاق سے مینہ برس گیا۔اس سادہ سی بات کو بیان کرنے کے لیے حفیظ کے تخیل نے یہ سماں باندھا کہ خود صحرا کے دل میں آرزو پیدا کی کہ جس طرح ہو سکے اپنے مقدس اور مقتدر مہمانوں کے لیے پانی بہم پہنچائے۔

اس موقع پر دعائے صحرا کے نام سے جو ٹکڑا حفیظ کے قلم سے نکل گیا ہے۔وہ ان کے ادبی کارناموں میں پائیدار شہرت کا مستحق ہے۔ یہاں تخیل نے اپنا زور دکھایا ہے مگر کسی تاریخی واقعے میں تصرف نہیں کرنا پڑا۔(اس نظم کے اشعار پہلے نقل کیے جا چکے ہیں)

یہ تشنہ لب جماعت جب یہاں پر رک گئی آ کر
دعا کی دامن صحرا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر

جنگِ بدر میں کفار کی شکست کی خبر مکے میں اس طرح پہنچتی ہے۔

یہاں کا حال دیکھا اب وہاں کا رنگ بھی دیکھیں
ذرا چل کر شکستِ بانیانِ جنگ بھی دیکھیں
نہ تھا باطل کے دل میں وہم تک اپنی خرابی کا
ہمہ تن شہرِ مکہ منتظر تھا فتح یابی کا
بہت غرّہ تھا سازِ جنگ پر جنگی لیاقت پر
یقیں رکھتے تھے اپنی فوج کی تعداد و طاقت پر
بہت عاجز سمجھتے تھے محمدؐ کے غلاموں کو
وطن سے کر چکے تھے بے وطن عالی مقاموں کو
اُنہیں پورا یقیں تھا فوج فاتح بن کے آئے گی
مسلمانوں کے سر، مالِ غنیمت ساتھ لائے گی

نویدِ فتح مندی کا تھا، ایسا اعتبار اُن کو
کہ گھر میں بیٹھے رہنے پر نہ آتا تھا قرار اُن کو
جما کر خون کے منظر، خیالوں اور نگاہوں میں
نکل کر بیٹھ جاتے تھے بسا اوقات راہوں میں
حجر میں ایک دن صفوان و اہل مکہ بھی اکثر
اسی اُمید پر بیٹھے ہوئے تھے شہر سے باہر
نظر آیا کہ بھاگم بھاگ اک انسان آتا ہے
سراسیمہ ، ہراساں اور بے سامان آتا ہے
نہیں تھی ستر کی سدھ بدھ، نئے پیچھا تھا نہ آگا تھا
مسلمانوں سے لڑ کر بدر کے میداں سے بھاگا تھا
سماتا تھا نہ اُس کے پیٹ میں دم، ہول کے مارے
زباں پر اُس کے تھا مارے گئے، مارے گئے سارے
یہ اک مردِ خزاعی تھا، اُسے لوگوں نے پہچانا
کسی نے راستے میں اس کو لوٹا ہے یہ گردانا
کہا ! اے مردِ سودائی یہ کیسی دھن سمائی ہے
کہ یوں مارے گئے مارے گئے کی رٹ لگائی ہے
وہ بولا واقعی مارے گئے مارے گئے سارے
یہ بولے کون؟ وہ بولا سبھی سردار بے چارے
یہ اب بھی کچھ نہ سمجھے اور پوچھا تو نے کیا دیکھا
وہ بولا کچھ نہیں، بس بھاگ آنے میں مزا دیکھا
یہ سمجھے فتح ہوجانے سے پہلے بھاگ آیا ہے

بڑا بزدل ہے، دل میں خوف کا خطرہ سمایا ہے
کہا مارے گئے جو لوگ اُن کے نام تو لینا
وہ بولا میں بتاتا ہوں، مجھے پانی ذرا دینا
ملا پانی، تو اُس بھاگے ہوئے کے دم میں دم آیا
توانائی جو پائی پھر اُسی صورت سے چلّایا
اجی کشتوں کے پشتے لگ گئے اک آن کے اندر
بڑے سردار سب مارے گئے میدان کے اندر
یہ سمجھے ذکر کرتا ہے مسلمانوں کے لشکر کا
صفایا ہوگیا اُس قوم کے ہر ایک افسر کا
کہا اچھا ہوا مارے گئے ، تم ہوش میں آؤ
جو مارے جاچکے ہیں، ہم کو سب کے نام بتلاؤ
وہ بولا کیا کہا، اچھا ہوا مرنا بزرگوں کا
تمھیں تو آج ماتم چاہیے کرنا بزرگوں کا
بہت روئے گی قرشی قوم اُن عالی نژادوں کو
جو لے جاتے تھے میداں میں، سواروں اور پیادوں کو
سپہ سالار عتبہ ، بوالحکم، بو قرش اور شیبہ
ولید و عاص، اُمیہ بن خلف، بوبختری زمعہ
سبھی مارے گئے اسود کے اور حجاج کے بیٹے
ہبل کے نام پر قرباں ہوئے تقدیر کے ہیٹے
ہنسا یہ سن کے صفواں اور بولا طرفہ مضموں ہے
یہ اپنے ہوش میں ہرگز نہیں، پاگل ہے مجنوں ہے

لیا ہے نام اس کمبخت نے اُن پختہ کاروں کا
جو تنہا جنگ میں منہ پھیر دیتے ہیں ہزاروں کا
بھلا اُس سے مری نسبت تو پوچھو کیا بتاتا ہے
مجھے پہچانتا ہے یا سناونی ہی سناتا ہے
کہا اچھا بتا صفوان کو کس حال میں دیکھا
وہ بھاگ آیا کہ اُس کو موت ہی کے جال میں دیکھا
وہ بولا، خوب۔ گویا تم مجھے مجنوں سمجھتے ہو
مرے سچے بیاں کو اور ہی مضموں سمجھتے ہو
یہ کیا بیٹھا ہوا ہے سامنے صفوان بے چارا
مسلمانوں نے جس کے بھائی کو اور باپ کو مارا
یہ سن کے ہکے بکے رہ گئے شیطان کے بندے
ہزیمت پر یقیں لاتے نہ تھے سامان کے بندے
مگر کچھ دیر میں بھاگے ہوئے کچھ اور بھی آئے
اسی حالت میں آئے اور ایسی ہی خبر لائے
وہ زرہیں اور بکتر اور ملبوساتِ فولادی
وہ شمشیر افگنی، وہ جوش ، وہ فن اور وہ اُستادی
وہ ڈھالیں اور تلواریں، وہ تیرو نیزہ و خنجر
کہ نکلے تھے بھروسہ کر کے جس سامان کے اُوپر
وہ سب دے کر بمشکل اپنی جانیں لے کر آئے تھے
بسانِ زخم فریادی زبانیں لے کے آئے تھے
غرض اب شہرِ مکہ میں ہزیمت کی خبر پہنچی

مصیبت کو بہ کو ، خانہ بہ خانہ، در بہ در پہنچی
پکارا، بولہب، لوگو ذرا خاموش ہوجاؤ
تم آؤ اے ابو سفیاں ہمیں یہ بات سمجھاؤ
ہمیں معلوم ہے تعداد میں وہ لوگ تھوڑے ہیں
نہ اُن کے پاس تلواریں، نہ اُن کے پاس گھوڑے ہیں
نہ اُن لوگوں کا امدادی ہے دنیا میں کہیں کوئی
سوائے حمزہؓ، فنِ جنگ سے واقف نہیں کوئی
ہمیں جھک کر سلامیں کرتے رہتے تھے سرِ راہے
وہ حرب وضرب کیا جانیں، بھلا یثرب کے چرواہے
اُنہیں تو رات کے کھانے کو روٹی تک نہیں ملتی
ٹھہرنے کے لیے تنبوتنبوٹی تک نہیں ملتی
کہاں سے مل گئی آخر کمک میرے بھتیجے کو
کہ ایسا لشکرِ جرار پہنچا اس نتیجے کو
بتا وہ کون سی بجلی گری تیغ آزماؤں پر
کہ اُس کا اک خدا غالب ہوا سارے خداؤں پر
مجھے بتلاؤ تم میدان میں کس بات سے ہارے
قریشی فوج میں جنگ آزمودہ تھے جواں سارے
وہ سب مارے گئے، پکڑے گئے، یہ کیا ہوا آخر
طلسمی کارخانہ تو نہ تھا، میدان تھا آخر

شاہ نامہ اسلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ضمناً مگر نہایت دلآویز طریق سے اسلامی اخلاقیات کی تلقین کی گئی ہے۔ جلد دوم کے وہ حصے بڑے پُر لطف اور پُر اثر ہیں جن میں جہاد کے

اصلی معنی واضح کیے گئے ہیں اور وہ اصول بتائے گئے ہیں جو آنحضرتؐ نے اپنی فتوحات کے بعد خود ملحوظ رکھے۔ اور جن پر کاربند رہنے کی تلقین کی۔

خبردار آ نہ جائے لشکر باطل قریں جب تک
نہ ہو ان کی طرف سے حملہ ہونے کا یقیں جب تک
لڑائی کے لیے اس وقت تک جنبش نہ تم کرنا
نہ ہو مجبور جب تک جنگ کی خواہش نہ تم کرنا
لڑائی ٹال دینا درگزر کرنا ہی بہتر ہے
جہاں تک ہو سکے اس سے حذر کرنا ہی بہتر ہے
مگر جب جنگ چھڑ جائے تو استقلال لازم ہے
قضا کا خندہ پیشانی سے استقبال لازم ہے

جنگ بدر سے آنحضرتؐ اور صحابۂ کرامؓ واپس تشریف لا رہے ہیں۔

سر و سینہ کو وقفِ تیغ و خنجر کر کے آئے تھے
رہِ حق میں یہ پہلا معرکہ سر کر کے آئے تھے
مگر اس فتح پر کوئی نہ شورش تھی نہ ہنگامہ
نہ کوئی ناچ گانا تھا نہ باجے تھے نہ دمّامہ

اور پھر اسیران جنگ کے بارے میں آنحضورؐ کا ارشادِ گرامی

اسیروں کو ہمیشہ عزت و اکرام سے رکھنا
کوئی صدمہ نہ پہنچانا، بہت آرام سے رکھنا
نہیں کرتا پسند اللہ سختی کرنے والوں کو
کہ جنت کی بشارت ہے خدا سے ڈرنے والوں کو

مدینہ پہنچنے پر جو زندگی مسلمانوں نے اپنے ہادیء برحق کے زیرِ سایہ شروع کی، اس کا

نقشہ ذیل کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

تھے انصار و مہاجر اک نمونہ شانِ وحدت کا
کہ اس تسبیح میں تھا رشتہء محکم اخوت کا
مسلماں تھے کہ تھیں زہد و ورع کی زندہ تصویریں
نمازیں اور تسبیحیں ، اذانیں اور تکبیریں
تجارت یا زراعت یا دعائیں یا مناجاتیں
مشقت کے لیے دن تھے، عبادت کے لیے راتیں

جہاد کے بارے میں اولین حکم جو آنحضرتؐ نے دیا۔ حفیظ نے ان اشعار میں واضح کیا ہے۔ اس سے بہتر اصول وضع کرنا ناممکن ہے۔ افسوس کہ دنیا اس حکم کے متعلق گونا گوں غلطیوں میں مبتلا ہے۔

کہا راہِ خدا میں تم کو لڑنے کی اجازت ہے
خدا کے دشمنوں کو دفع کرنے کی اجازت ہے
مگر تم یاد رکھو صاف ہے یہ حکم قرآں کا
ستانا بے گناہوں کو نہیں شیوہ مسلماں کا
نہیں دیتا اجازت پیش دستی کی خدا ہرگز
مسلماں ہو تو لڑنے میں نہ کرنا ابتدا ہرگز
فقط ان سے لڑو جو لوگ تم سے جنگ کرتے ہیں
فقط ان سے لڑو جو تم پہ جینا تنگ کرتے ہیں

اسلامی تاریخ کے واقعات اور اسلامی تعلیمات و اخلاقیات پر مبنی اس سادہ رواں دلآویز اور دلپذیر شاعری کو اگر قبول خاص و عام حاصل ہوا تو اس میں بھلا تعجب کی کیا بات ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ اپنے آخری ایام میں حفیظ جالندھری کو اکثر اپنے ہاں بلایا کرتے تھے اور شاہنامہ اسلام سے نعتیہ اشعار ان کے مخصوص ترنم میں سنا کرتے تھے۔ ایسے لمحات میں اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ شاہنامہ اسلام میں موجود نعتیہ اشعار زیرِ نظر کتاب میں کئی مقامات پر نقل کیے گئے ہیں۔ مزید ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

محمدؐ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو ایماں نامکمل ہے
محمدؐ کی محبت خون کے رشتوں سے بالا ہے
یہ رشتہ دنیوی قانون کے رشتوں سے بالا ہے
محمدؐ ہے متاعِ عالم ایجاد سے پیارا
پدر، مادر، برادر، مال و جاں، اولاد سے پیارا
محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونے کی

☆☆............☆☆

پاکستان کا قومی ترانہ

پاکستان کے قومی ترانے کے خالق کے ذہن میں اپنے وطن کے قومی ترانے کا کیا تصور تھا خود انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''دسمبر ۱۹۴۷ء میں مرحوم لیاقت علی خان وزیرِ اعظم پاکستان راولپنڈی تشریف لائے تھے۔ مجھ سے قومی ترانے پر کچھ بات ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ قومی ترانہ نہ تو خالی شعر وشاعری ہے اور نہ عام بازاری موسیقی۔ یہ ملت کو زندگی دینے والی روح کا اظہار الفاظ میں ہوتا ہے۔ الفاظ مناسب وموزوں اعتدال کے ساتھ مرتب ہوکر وہ نغمہ ءحیات بنتے ہیں جو اس قوم وملت کا مقصود ہے۔ الفاظ کی یہ موزونیت دھن کہلاتی ہے۔ یہ دھن سازوں سے ہم آہنگ ہوکر ہر فرد میں ملی زندگی کی امنگ قائم رکھتی اور پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ دھن اور الفاظ دونوں کو بیک وقت فوجی اور شہری سازوں کی آواز سے ہم رنگ وہم آہنگ منصۂ شہود پر لانا ضروری ہے۔ شاعر کو حسنِ صوت یعنی الفاظ کی اپنی دلکش موسیقی سے معمور ہونا چاہیے اور شاعر کا کن رس ہونا اور ساتھ ہی دل وجان کے ساتھ ملت کی روح سے ہم آہنگ ہونا لازم ہے۔ شاعر کی یہ تینوں صلاحیتیں اور تخلیقی قوتیں جب تک بروئے کار نہ آئیں گی، قومی ترانہ نہ بن سکے گا۔''

لیاقت علی خان نے فرمایا: ''آپ کے سوا دوسرا کون ہے؟''

میں نے عرض کیا: اگر مجھ سے یہ خدمت طلب کرتے ہیں تو مجھے گاہے گاہے آرکسٹرا کے چند سازندوں اور ایک فوجی بینڈ ماسٹر کی ضرورت بھی ہوگی۔

میری اس وضاحت پر جناب لیاقت نے مسرت کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ کراچی پہنچتے ہی ریڈیو پاکستان کو حکم دے دیا جائے گا۔

حفیظ صاحب محترم لیاقت علی خان کے ارشاد کے مطابق اس حکم اور اس پر عمل درآمد کرنے کے منتظر تھے کہ چند روز بعد حکومت کی طرف سے ایک اشتہار شائع ہوا۔ کہ دس ہزار روپیہ اس شخص کو انعام دیا جائے گا جو قومی ترانے کے الفاظ اور دھن دونوں تیار کرے۔ لیکن اگر کوئی شاعر محض الفاظ میں قومی ترانہ تخلیق کرے اور اسے منظور کر لیا جائے لیکن اس کی دھن کوئی دوسرا موسیقار بنائے تو ان دونوں کو پانچ پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔

پھر ایک ترانہ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ مندرجہ ذیل حضرات اس کے ارکان مقرر ہوئے:

۱۔ سردار عبدالرّب نشتر مرکزی وزیر
۲۔ پیرزادہ عبدالستار مرکزی وزیر
۳۔ پروفیسر چکراورتی بنگالی رکن دستور ساز اسمبلی
۴۔ چوہدری نذیر احمد خان پنجابی رکن دستور ساز اسمبلی
۵۔ سید ذوالفقار علی بخاری کنٹرولر ریڈیو پاکستان
۶۔ جناب اے ڈی اظہر سخن فہم
۷۔ جناب جسیم الدین بنگالی شاعر
۸۔ جناب حفیظ جالندھری اُردو شاعر
۹۔ جناب ایس ایم اکرام جائنٹ سیکریٹری، حکومت پاکستان کنوینر و سیکریٹری ترانہ کمیٹی

اس طرح یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا اور طول کھینچتا چلا گیا۔ ترانہ کمیٹی نے بڑی ردوقدح

کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ ترانہ لازماً اسلامی ہو لیکن اس میں اللہ اور محمدؐ کا نام، اسلام جہاد اور شہادت کے الفاظ نہ ہوں۔

اس کے بعد اس اہم قومی فریضے کے بارے میں حکومت تساہل اور گومگو کا شکار ہو گئی۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اپریل ۱۹۴۹ء میں وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان انگلستان تشریف لے گئے تو وہاں ایک پریس کانفرنس میں مشہور اخبار ڈیلی ٹیلی گراف کے نمائندے نے جب وزیر اعظم پاکستان سے پوچھا کہ: ''کیا پاکستان کا کوئی قومی ترانہ (National Anthem) ہے؟ تو وزیرِ اعظم نے یہ جواب دیا کہ: ''قومی ترانہ بنانے میں ہماری مدد کریں۔''

(روزنامہ ڈان کراچی، ۳ مئی ۱۹۴۹ء)

اس کے بعد ۲۳ اگست ۱۹۴۹ء کو اخبارات میں یہ خبر چھپی:

''کراچی۔ یاد ہوگا کہ حکومت پاکستان نے قومی ترانے کے سلسلے میں ملک کے ادیبوں اور شاعروں سے قومی ترانہ بنانے کے لیے کہا تھا اور انعام کا اعلان بھی کیا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ آج پاکستان کے قومی ترانے کی کمیٹی نے ریڈیو پاکستان اور مسٹر چھاگلہ کی بنائی ہوئی دھن منظور کر لی ہے۔''

(امروز، ۲۳ اگست، ۱۹۴۹ء)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترانہ کمیٹی کے اس اجلاس میں جو بغیر کسی نوٹس اور ایجنڈے کے اچانک ہنگامی طور پر بلایا گیا تھا۔ حفیظ صاحب بطور رکن ترانہ کمیٹی موجود نہ تھے۔

اب قومی ترانے کا کچھ حال جناب شاہد احمد دہلوی ایڈیٹر ساقی کے الفاظ میں دیکھیے:

''شعر و موسیقی میں جو ربط ہے۔ حفیظ صاحب میں، اس کا سب شاعروں سے بڑھ کر شعور ہے۔ اس کی ایک بیّن مثال ''ترانۂ پاکستان'' ہے۔ میں اس وقت ریڈیو پاکستان میں نگران موسیقی تھا۔ ترانۂ پاکستان کا غلغلہ اُٹھا۔ صبح سے شام تک دھن بنانے والے اپنے سَروں کو دُھنتے اور اپنی اپنی

دُھنیں ریکارڈ کروا کے چلے جاتے۔ کراچی کے علاوہ اور شہروں سے بھی دھنوں کے ریکارڈ اس مقابلے میں شریک کیے گئے تھے اور اس وقت کے وزیراعظم لیاقت علی خان کو منتخب دُھنیں سنائی گئی تھیں۔ چھاگلہ مرحوم کی دُھن سب میں بہتر سمجھی گئی تھی۔ ان کے بعد جو وزیراعظم تشریف لائے تھے انھوں نے مزید انتظار کیے بغیر چھاگلہ کی دُھن منظور کر لی۔ اس کے بعد شاعروں کو اذن عام دیا گیا کہ اس دُھن پر ترانۂ پاکستان کے بول بٹھاؤ۔ اب پھر شاعروں کی تاخت ریڈیو پاکستان پر ہونے لگی۔ بڑے بڑوں نے زور مارا۔ ان سب کے ریکارڈ بھی بھرے گئے۔ حفیظ صاحب نے بھی اپنا ترانا ریکارڈ کرایا۔ پھر ان سب بولوں کی جانچ جانے کن کن بڑے بڑے ماہروں نے کی اور سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ حفیظ صاحب کا ترانہ سب سے بہتر ہے۔ میں نے بھی ریکارڈنگ کے دوران میں بعض نامی شاعروں کے بول دیکھے اور سُنے تھے۔ واقع میں حفیظ صاحب کے ترانے سے بہتر تو کجا کوئی اس کا پاسنگ بھی نہیں تھا۔ یہ کتنے بڑے اعزاز اور سرفرازی کی بات ہے کہ کسی شاعر کا لکھا ہوا ترانہ پوری قوم اور ملک کا ترانہ بن جائے۔ یہ افتخار حفیظ صاحب کو حاصل ہوا اور وہی اس کے مستحق بھی تھے۔

اس کامیابی کا اعلان ہونا تھا کہ یار لوگ کوئلوں پر لوٹ گئے اور تو اور حفیظ صاحب کے قریب ترین دوست وقدردان، عبدالمجید سالک اور مجید لاہوری جیسے بھی ہتھے سے اکھڑ گئے اور نہ صرف اس ترانے کی مخالفت ان دوستوں نے کی بلکہ اس کا مذاق بھی اُڑایا اور اس کی پیروڈیاں بھی لکھیں۔ ان کے ایک دوست نے اسی بحر اور اسی دُھن میں ایک فحش قسم کی پیروڈی لکھی۔

جسے وہ مزے لے لے کر حفیظ صاحب کی موجودگی میں دوستوں کو سنایا کرتا تھا۔''

حفیظ صاحب نے کیا سچ کہا ہے:

خبثِ درُوں دکھا دیا ہر دہن غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے ، ہنس دیا، مسکرا دیا

یاروں کی برہمی پہ ہنسی آگئی حفیظ
یہ مجھ سے ایک اور بُری بات ہو گئی
دیکھا جو کھا کے تیر، کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

پاکستان کے قومی ترانے پر بعض ناسمجھ اور اُردو سے نابلد لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ ترانۂ پاکستان کی قومی زبان میں نہیں ہے۔ سوائے لفظ ''کا'' کے باقی سارے الفاظ فارسی کے ہیں۔ اس سے زیادہ جاہلانہ اعتراض اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اِن اَن پڑھ اور بے علم لوگوں سے جو یہ بے سروپا اعتراض کرتے ہیں میں یہ پوچھتا ہوں کہ پاکستان کے قومی ترانے میں کون سا ایسا لفظ ہے جو اُردو زبان میں ہر روز استعمال نہیں ہوتا۔ اُردو کا کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیں۔ اُردو کی کسی کتاب، نظم ونثر کی ورق گردانی کرلیں قومی ترانے کے سارے الفاظ بار بار اور ہر جگہ نظر آئیں گے۔ یہ سب اُردو زبان کے الفاظ ہیں۔ اُردو مختلف زبانوں کے میل جول سے ہی تو بنی ہے۔ اس کے سارے الفاظ دوسری زبانوں سے مستعار ہیں۔ ترکی، فارسی، عربی، سنسکرت، پنجابی یہ ساری وہ زبانیں ہیں جن کے الفاظ نے آپس میں مل کر اُردو زبان کو جنم دیا ہے اور اُردو میں استعمال ہونے والے ان ساری زبانوں کے الفاظ اب اُردو ہی کے الفاظ ہیں۔ قومی ترانے کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ یہ خالص اُردو زبان میں ہے۔ مگر اسے افغانستان اور ایران والے بھی جو پاکستان

کے پڑوسی مسلمان ممالک ہیں پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ترانہ ان تینوں ملکوں میں اتحاد و یگانگت کے جذبات ابھارتا ہے۔

اب ایک دفعہ پھر جناب محمد طفیل صاحب کی طرف آتے ہیں۔ اپنی کتاب مخدومی میں لکھتے ہیں:

''۳۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو یونیورسٹی کیمپس میں دانشوروں سے خطاب کرنا تھا۔ میں بھی اس جلسے میں موجود تھا۔ مگر میں چاہتا تھا کہ اس دن کی کاروائی کے تاثرات خود حفیظ صاحب کی زبانی سنوں۔ کیوں کہ اس جلسے میں بھٹو صاحب نے انھیں مخاطب کر کے بھی اُن کی شان بڑھائی تھی۔ میں اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ اب یہ کس مقام سے بولتے ہیں۔

''بھٹو صاحب کی اُس دن کی تقریر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''بھٹو صاحب مجھ سے ناراض تھے۔''

''وجہ؟''

''وجہ یہ تھی کہ جب بھٹو صاحب انتخاب لڑ رہے تھے تو ان کے مخالف امیدوار ڈاکٹر جاوید اقبال تھے اور میں ان کا حامی تھا۔ اس لیے کہ وہ علامہ اقبال کا بیٹا ہے۔''

''مگر جلسے میں تو انھوں نے آپ کا حال احوال پوچھا اور یہ بھی کہا: ''آپ نے قومی ترانہ لکھا ہے۔ اب ہمیں انقلابی ترانہ لکھ کر دیں۔''

''جی ہاں! یہ ٹھیک ہے مگر میں تو پہلے سے کہہ رہا ہوں۔''

''قوتِ اخوتِ عوام''

سال رواں ۲۰۱۰ء میں حفیظ کے قومی ترانے کے خلاف ایک نیا شوشہ اور اُٹھا۔ اس دفعہ بھارت سے آنجہانی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے بیٹے نے بیان داغ دیا کہ: ''قائداعظمؒ نے میرے

والدصاحب سے پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کی فرمائش کی تھی ۔جس کی تعمیل میں انھوں نے ترانہ لکھا تھا مگر وہ بعد میں حکومت پاکستان نے منظور نہیں کیا۔'' یہ بیان سراسر بے بنیاد اور محض شرارت پر مبنی ہے۔اگر ایسا کوئی واقعہ ہوتا تو پروفیسر جگن ناتھ آزاد اپنی بے شمار تحریروں اور متعدد تصنیفات میں کہیں تو اس واقعے کا ذکر کرتے ۔نہ صرف یہ کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنی کسی تحریر میں کہیں اس واقعے کا ذکر تو کیا ہلکا سا کوئی اشارہ تک بھی نہیں کیا بلکہ اپنے پاکستانی دوستوں سے ملاقاتوں کے دوران کبھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کی کہ انھیں حضرت قائداعظمؒ نے پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کو کہا تھا۔خود مجھ سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی دو خاصی طویل ملاقاتیں رہی ہیں۔نومبر ۱۹۷۷ء میں اقبال کے سوسالہ یوم پیدائش پر جب وہ سیالکوٹ تشریف لائے تھے۔اس دوران ایک دوپہر رات گئے تک کئی گھنٹے ان سے صحبت رہی۔فاروق روہکڑی صاحب کی عادل بیوریجز فیکٹری کے جنرل منیجر کرنل شیر محمد شاد مرحوم نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو اور مجھے اپنے ہاں لنچ پر مدعو کیا ہوا تھا۔ یہ سیالکوٹ میں مندوبین کے قیام کا آخری دن تھا۔روہکڑی صاحب کا تعلق میانوالی سے ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد بھی میانوالی کے قریب ایک قصبے موسیٰ خیل کے رہنے والے تھے۔اس علاقائی تعلق کے ناطے فاروق روہکڑی صاحب کی خواہش تھی کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو مدعو کیا جائے اور ان کی صحبت میں ان کے آنجہانی والد اور اُردو کے مشہور شاعر تلوک چند محروم کی یاد تازہ کی جائے۔ پروفیسر تلوک چند محروم اپنی آخری عمر میں ،قیام پاکستان سے چند سال پہلے، گورڈن کالج راولپنڈی میں فارسی کے اُستاد بننے سے قبل ساری زندگی میانوالی اور اس کے گرد ونواح کے دیہات میں مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔بطور شاعر ہی نہیں بلکہ بطور ایک شفیق اور لائق اُستاد کے سارے علاقے میں ان کا بڑا ادب اور احترام تھا۔کرنل شیر محمد شاد جو اٹک کے رہنے والے تھے۔۱۹۴۰ء کے عشرے میں کئی بار تلوک چند محروم سے مل چکے تھے۔کرنل صاحب کو شعرو شاعری سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ جب وہ زمانۂ طالب علمی میں اسلامیہ کالج لاہور کے کریسنٹ ہوسٹل میں مقیم تھے تو ایک دفعہ جب تلوک چند محروم لاہور تشریف لائے تو کرنل شیر محمد

شاد کے ہوسٹل کے کمرے میں قیام پذیر ہوئے۔ کرنل صاحب کا کریسنٹ ہوسٹل کا کمرہ شاعروں کی بیٹھک تھا۔ کئی دفعہ اختر شیرانی نے وہاں محفل ناؤنوش جمائی۔

۱۹۷۰ء میں جب میں واہ چھاؤنی میں کنٹونمنٹ ایگزیکٹو آفیسر تھا تو خوش قسمتی سے کرنل شیر محمد شاد کنٹونمنٹ بورڈ کے پریذیڈنٹ تھے۔ خوش قسمتی سے اس لیے کہ زندگی میں ان جیسا سخن فہم، قدر شناس اور یاروں کا یار ملنا مشکل ہے۔ یہ سب کچھ میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ قارئین اندازہ لگا سکیں کہ سیالکوٹ میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے میری طویل ملاقات کس بے تکلف اور شاعرانہ ماحول میں ہوئی۔ شعر و ادب سے متعلق ہر موضوع زیر بحث رہا۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی گفتگو سے پتہ چلا کہ ان کو اور ان کے والد گرامی جناب تلوک چند محروم کو حضرت حفیظ جالندھری سے بڑی شیفتگی اور عقیدت تھی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو تو شاہ نامہ اسلام کے کئی اشعار یاد تھے۔ جو انھوں نے ہمیں ترنم سے سنائے۔ شاہ نامہ اسلام میں حفیظ کی مشہور نظم ''صحرا کی دعا'' انھیں ساری یاد تھی۔ چونکہ یہ نظم مجھے بھی ساتویں جماعت سے ازبر ہے۔ ہم دونوں باری باری اس کے شعر ایک دوسرے کو سناتے رہے اور محفل محظوظ ہوتی رہی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو حفیظ کا مشہور سلام:

سلام اے آمنہ کے لال ، اے محبوب سبحانی

بھی زبانی یاد تھا۔ انھوں نے حفیظ کی نقل کرتے ہوئے ترنم سے ہمیں سارا سلام سنایا۔ ایسی بے تکلف اور بے محابا گفتگو میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اگر حفیظ کے قومی ترانے سے متعلق کسی قسم کی کوئی ایسی بات ہوتی جواب پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے بیٹے نے ان کی وفات کے بعد بنائی ہے تو اس کا ذکر نہ آتا۔ جہاں تک تحریری شہادت کا تعلق ہے اس پر تو میں نے پہلے اظہار خیال کر دیا ہے کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کہیں اپنی کسی تحریر میں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے میری دوسری طویل ملاقت امرتسر میں ہوئی۔ جب میں جناب خالد اقبال یاسر اور ڈاکٹر اختر شمار کے ہمراہ آل انڈو پاک مشاعرے میں گیا۔ جناب مرتضیٰ

برلاس صاحب نے بھی اس مشاعرے میں شرکت کی۔مگر وہ ہمارے ساتھ نہیں گئے تھے۔لاہور سے دہلی اور وہاں سے امرتسر پہنچے تھے۔جگن ناتھ آزاد سے میری یہ ملاقات بھی دیر تک رہی اور اتفاق سے موضوع گفتگو حفیظ اور ان کی شاعری رہی۔اس کی بنیادی وجہ حفیظ کے ساتھ ہم دونوں کی والہانہ شیفتگی تھی۔میں نے ان سے کہہ دیا کہ ایک تو آپ نے ابوالکلام آزاد کی محبت میں اپنا تخلص آزاد رکھا ہوا ہے دوسرے آپ حفیظ کے شیدائی ہیں۔شاہ نامہ اسلام کے بے شمار اشعار حفظ کرر کھے ہیں۔نعتیں بھی لکھتے ہیں۔اب مسلمان ہونے میں کیا امر مانع ہے۔کہنے لگے۔اپنا ماضی اور خاندانی مجبوری۔پھر حفیظ جالندھری کا تذکرہ چل نکلا مگر کہیں انھوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے پاکستان کا کوئی قومی ترانہ لکھا تھا۔اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو ممکن نہیں تھا کہ اس کا ذکر نہ آتا۔

جب چند ماہ قبل یہ شوشہ اخبارات میں نکلا تو اُردو کے مشہور اُستاد اور نقاد جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ذکریا نے ایک ٹی وی چینل پر اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ دعویٰ کہ حضرت قائداعظمؒ نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کو کہا تھا سرے سے غلط اور بے بنیاد ہے۔حضرت قائداعظمؒ سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی بالمشافہ ملاقات ہی جس کا دعویٰ ان کے بیٹے نے کیا ہے ثابت نہیں ہوتی۔پہلے مصدقہ طور پر یہ تو بتایا جائے کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد حضرت قائداعظمؒ سے کب اور کہاں ملے تھے۔

حفیظ کی شاعرانہ عظمت
(حفیظ کے فنی کمالات)

محمد طفیل مدیر نقوش لکھتے ہیں:

''اُردو نظم کو جتنی سُندرتا، جتنی انوکھی بحریں، جتنا ''مترنمیہ'' بیان اور جتنا نیا انداز حفیظ صاحب نے بخشا ہے کم ہی کسی شاعر کو نصیب ہوا ہو گا۔ اگر کوئی ان حقائق کو تسلیم نہیں کرتا تو وہ کوئی ہٹ دھرم ہو گا۔ معقول آدمی نہ ہو گا۔

ہر حکومت نے انھیں نوازا، انگریز نے خان بہادر کا خطاب دیا۔ پاکستان کی فوجی حکومتوں نے ہلال امتیاز اور پرائڈ آف پرفارمنس کے اعزازات سے نوازا۔ قوم و ملت نے انھیں ملک الشعرا، حسان الملک، فردوسیءاسلام اور شاعر پاکستان تک کے القابات سے نوازا۔ مگر انھیں جس اعزاز پر سب سے زیادہ خوشی ہوئی وہ ہے ہائی کورٹ کی ایک تقریب، جس میں انھیں چاندی کا قلمدان پیش کیا گیا۔ اس تقریب کے بارے میں انھوں نے کہا ہے:

''عالی جاہو! پاکستان میں مظلوموں کی پنا ہو۔ میں آج دارالعدل میں حاضر ہوں۔ جو ہدیہ آج مجھے اس بارگاہ سے عطا ہوا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی اعزاز مجھ ناچیز کے لیے ممکن نہیں۔'' (مخدومی صفحہ ۵۸،۵۹)

جوش ملیح آبادی، حضرت حفیظ جالندھری کے جشن پنجاہ سالگی کے موقع پر رقم طراز ہیں:

''میرے اور حضرت حفیظ کے مابین ذہنی و عملی اختلافات کی مجال نہیں کہ وہ مجھے راہِ مستقیم سے ہٹا کر حفیظ صاحب کے شاعرانہ جمال سے انکار کر

دینے کی حماقت میں مبتلا کردیں۔حفیظ صاحب ایک ایسے شیریں مقال شاعر ہیں جودلوں میں گھر کر چکے ہیں۔ان کی شاعری،لطافت،سلاست، مٹھاس،شگفتگی، روانی، رنگینی اور راگنی کی لپٹوں سے مہکی ہوئی ہے۔ان کے رسیلے گیت فضا میں ساون کے بادلوں کی طرح جھوم رہے ہیں اوران کا دل نشیں سامعہ نواز ترنم ادب کی محراب میں وہ جھنکار پیدا کیے ہوئے ہے کہ زہرہ آسمان پر رقص کررہی ہے۔''

رسالہ ''نگار'' کے مدیراورمشہورنقاداوراد یب نیاز فتح پوری نے لکھا:

سرزمین پنجاب نے دوغیر فانی شاعر پیدا کیےایک اقبال،اوردوسرا حفیظ۔

اقبال نے کہا:

خونے بہ جگر جمع کن و رنگ بروں آر

حفیظ نے کہا:

نظارہ کن ز چاکِ کتاں، ماہتاب را

دنیانہ اُسے بھلاسکی نہ اِسے'

(مخدومی صفحہ ۱۵۵)

حفیظ کے گیتوں کے متعلق فراق گورکھپوری نے اپنی ایک براڈ کاسٹ تقریر(۱۹۴۰ء) میں کہا تھا:

''یہ اُبلتی ہوئی اوراٹھلاتی ہوئی جوانی، یہ بےتکلف اور بےلاگ رچاؤاور نکھار، یہ شوخ رنگینی، یہ دھن، یہ سُر یلا پن، یہ رنگ، یہ رس، یہ کسک اور یہ انگڑائیاں، ہم کو آج تک کسی اور شاعر میں نہیں ملیں۔معلوم ہوتا ہے کہ مصرعےاوراشعار کہے نہیں گئے ہیں بلکہ چھلک پڑے ہیں۔''

(افکار۔حفیظ نمبر صفحہ ۵۱۶)

سر راس مسعود کہتے ہیں:

''میں حفیظ کے رنگِ سخن پر شیدا ہوں۔اس کے سادہ مگر پُر اثر کلام سے ہمیشہ ایسی کیفیت میں ڈوب جاتا ہوں جس کا اظہار میری زبان نہیں کر سکتی۔اس کلام سے مجھ پر ہمیشہ ثابت ہوتا ہے کہ اُردو زبان کے ان سب بڑے بڑے شعرا میں جن کو میں جانتا ہوں ، ایک حفیظ ہی ایسا ہے جس کے متعلق میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کا دائرہ کار صرف مشاہدات اور محسوسات کی ترجمانی تک محدود ہے۔اور وہ اس دائرہ کار میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔'' (ماہنامہ افکار،حفیظ نمبر صفحہ ۱۱۰)

حفیظ پر کیا موقوف ہے میں سمجھتا ہوں دنیا میں جتنے بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں ان سب کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے مشاہدات و محسوسات کو اس رنگ سے مجسم کر دیتے ہیں کہ ہر دیکھنے اور محسوس کرنے والا ان کے مشاہدات و محسوسات کو خود اپنے مشاہدات و محسوسات پر یقین کرنے لگتا ہے۔

مصورِ مشرق حضرت عبدالرحمٰن چغتائی فرماتے ہیں:

''میرا کوئی مقام نہیں کہ میں اپنی بے کار لفاظی سے حفیظ جیسے بلند پایہ شاعر اور ادیب پر طبع آزمائی کروں۔جس کے ایجادات اور ندرت نے ہماری شاعری کا رنگ بدل ڈالا۔حفیظ ان شخصیات میں سے ہے جن سے کسی قوم کا وقار بلند ہوتا ہے اور قوم قوموں میں شمار ہوتی ہے۔

حفیظ اپنے الفاظ اور محاوروں کا مسیحا ہے۔ان میں اتنی گہرائی اور معنویت پیدا ہوگئی ہے کہ ضرب المثل بن گئے ہیں۔'' (افکار،حفیظ نمبر)

پروفیسر سید احمد شاہ بخاری (پطرس) حفیظ کی تعریف میں یوں رطب للسان ہیں:

''جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ

مدت سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کومبہوت کررہا ہے۔جس کے قلم کی ایک بے پرواجنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہوجاتی ہے۔قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہوجاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

ساون رُت، گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا، ہوا میں اُڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دید اور فراق کے آنسو، دل میں انتظار کی دھڑکن، یہ ایک مست کیف شاعر کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے۔

ہمارے شاعر برسوں سے ترکِ شیرازی پر مست ہیں۔یہ ایک ایسی شراب طہور سے بےخود ہونے کا بہانہ کررہے ہیں جو نہ خود پی سکتے ہیں نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے۔ (دیباچہ نغمہ زار)

ڈاکٹر تاثیر اپنے مضمون شاعرِ شباب میں رقم طراز ہیں:

''حفیظ کی شاعری امید افزا ابتدا سے تکمیل تک جا پہنچتی ہے۔مگر میرے دل میں جو جگہ نغمہ زار کی نظموں کے لیے ہے وہ کسی اور نظم کے لیے نہیں۔ نغمہ زار کے بعد حفیظ نے جو کچھ لکھا ہے وہ فن اور نفس مضمون کے اعتبار سے بلند تر ہے اور پختہ تر ہے۔متانت اور علوِ تخیل، لطافتِ الفاظ سے اس طرح ممزوج ہوئے ہیں کہ ادبیات میں اُن کا مقام جاودانی ہے۔مگر جو سبک سری، جو فرحت افزائی نغمہ زار کے الفاظ و معانی اور بحور میں ہے وہ اور کہیں نہیں ملتی۔نغمہ زار، حفیظ کا شباب ہے اور اس میں شباب کی جملہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جب تک اس عجوزہء دہر پر شباب

مسلط ہے، نغمہ زار کا سکہ جواں ہمت دلوں پر جما رہے گا۔

کسی ایک نظم یا غزل کو دیکھو، وہی شباب کی سرشوری، استغنا اور انانیت نظر آتی ہے۔ کرشن کنہیا، اس نام سے کسی قدر عقیدت وابستہ ہے۔ مگر شاعر نے اس عقیدت کو طوقِ گردن نہیں بنایا اور شاعرانہ سربلندی سے طرب و غنا کی مسرتوں کی آرزو کی ہے

بنسی میں جو لے ہے
نشہ ہے نہ لے ہے
کچھ اور ہی شے ہے
اک روح ہے رقصاں اک کیف ہے لرزاں
آنا نہ اکیلے ہوں ساتھ وہ میلے
سکھیوں کے جھمیلے

ہر نظم شباب کی حسن آفرینی اور جدت پسندی کا نمونہ ہے اور اس روحِ خیال کی ترجمانی کے لیے اسے انداز بھی تازہ ملا ہے۔

شعر اور نغمے کا تعلق تو شاعری کے مظہر یعنی الفاظ سے ظاہر ہے۔ الفاظ کیا ہیں۔ اصوات۔ ایسی آوازیں جن میں مختلف لوگوں نے مختلف معنی ڈال دیے ہیں۔ شاعری کیا ہے۔ بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب۔ بہترین اصوات کا مجموعہ، یہی وجہ ہے کہ مشاہیر شعرا اپنے شاہکار روزمرہ کے سوقیانہ بازاری اور تجارتی لہجہ کو ترک کر کے لے میں پڑھتے ہیں۔ اگر ایران کا عارف قزوینی بربط لے کر اپنی تصنیف گاتا پھرتا ہے تو زبورِ عجم کا مصنف آسا کی دُھن میں سامعین کے قلوب پر شعلہ ریز ہوتا ہے۔

شباب اور نغمہ۔ یہ ہے حفیظ کے اس دورِ اول کی خصوصیت۔ جس بنا پر میں

نغمہ زار کو نغمہ شباب کہا کرتا ہوں۔ غالباً اس طرزِ خیال کی بہترین ترجمانی کا گیت ہے۔ ''ابھی تو میں جوان ہوں''

یہ آسماں، یہ زمیں
نظارہ ہائے دلنشیں
انھیں حیات آفریں
بھلا میں چھوڑ دوں یہیں

ہے موت اس قدر قریں مجھے نہ آئے گا یقیں
نہیں نہیں ابھی نہیں ابھی تو میں جواں ہوں

بسنت ایک موسم ہے۔ جو ابتدائے آفرینش سے یکساں خصوصیات کے ساتھ آتا جاتا رہتا ہے مگر حفیظ اس میں خوشی اور غم دونوں قسم کے جذبات بھر دیتا ہے اور آخری بند تو گویا بسنت کا ایک مستقل مجازی نشان (Symbol) بن گیا ہے۔

اک نازنیں نے پہنے پھولوں کے زرد گہنے
ہے مگر اُداس
نہیں پی کے پاس
غم و رنج و یاس دل کو پڑے ہیں سہنے
اک نازنین نے پہنے
پھولوں کے زرد گہنے

منظر کشی مصوری میں ہو یا شاعری میں، شباب کا آزاد مشغلہ ہے۔ خالص مسرت کا بہترین نمونہ۔ اُردو شاعری کے اس نئے دور میں یہ مشغلہ بہت سے یورپ زدہ شعرا کا تختۂ مشق بنا رہا ہے اس میدان میں بھی حفیظ جملہ

معاصرین سے آگے نکل گیا ہے۔ نمودِ سحر کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

اٹھی حسینۂ سحر پہن کے سر پہ تاجِ زر

لباسِ نور زیب بر

چڑھی فرازِ کوہ پر

وہ خندۂ نگاہ سے پہاڑ طور بن گئے

وہ عکسِ جلوہ گاہ سے سحاب نور بن گئے

نوائے جوئبار اٹھی

صدائے آبشار اٹھی

ہواؤں کے رباب اٹھے خوش آمدید کے لیے

اٹھی حسینۂ سحر

پہن کے سر پہ تاج زر

اور اب ساون رُت کا ایک منظر

آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے

مہ پیکروں نے سیمیں تنوں نے

برق افگنوں نے

نازک دوپٹے رنگین ہلکے

سر پہ سنبھالے شانوں پہ ڈالے

اترا رہی ہیں

اٹھلا رہی ہیں

خوبانِ ہندی حورانِ ارضی

رونق گھروں کی

(جھولا)

قدیم ایرانی وعرب شعرا کے بعد ایشیائی شاعری سے صحیح منظر کشی مفقود ہوگئی ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بادیہ نشینی پر شہری تہذیب نے غلبہ پالیا ہے۔ اسی سبب سے جب لاہور کے مشاعروں میں آزاد مرحوم نے اُردو شاعری میں ایک نئی روح پھونکنی چاہی تو ان کے سامنے فقط ہول رائڈ صاحب کے بتائے ہوئے سطحی اصول تھے اور بس۔ جب حفیظ اس قسم کے اصولوں سے آزاد ہوکر اس میدان میں اُترا تو اس کی حالت بعینہ ان شعرا کی تھی جو اپنے لیے خود مشعل راہ ہوتے ہیں اور ادبی روایات کی بجائے محض اپنے حواس خمسہ کی پیروی کرتے ہیں۔

کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو

شام آئی ہے سکوں کے جال پھیلائے ہوئے
ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے

اس طرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں
جس طرح دیوؤں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں

جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہوگئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں

بے زباں خاموشیاں جاگیں، صدائیں سو گئیں
شورشیں چپ ہوگئیں، خاموشیوں میں کھو گئیں

ایک ہی مضمون کس قدر تنوع اور تازگی سے پیش کیا ہے۔''

پنڈت ہری چند اختر نے اپنے مضمون ''حفیظ کے فنی کمالات'' مطبوعہ افکار حفیظ نمبر میں لکھا ہے:

''حفیظ کے طرزِ سخن کو اُس کی خاص ندرت یا ایک آدھ جدت کی بنا پر اچھوتا نہیں کہا جاتا بلکہ اُردو شاعری کی عام روش و افتاد کو مدنظر رکھیں تو حفیظ کی شاعری ہر لحاظ سے نرالی ہے۔ موضوع کلام، مضمون و خیالات، بحور و قوافی کے استعمال، منظر کشی، تشبیہات، غرض کسی پہلو سے دیکھیے حفیظ کا کلام انقلاب انگیز جدتوں کا حامل نظر آئے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس چیز کو ہم اب تک ''ہماری شاعری'' کہتے رہے ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر اس کے سوا کسی اعتبار سے ہماری نہیں کہ اس کے مصنف ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اس شاعری میں خیالات و جذبات، محاورات وطرز تکلم، اصل تصویر اور پس منظر سب کچھ ایرانی ہے۔ ہندوستان کا کچھ بھی نہیں۔ اس قسم کی مصنوعی اور صرف شاعر کی اپنی ذات کو فریب میں مبتلا رکھنے والی شاعری کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہماری اُردو شاعری نے عام طور پر ایک غیر فطری شکل اختیار کر لی ہے۔ مثلاً موسم کا استقبال، بسنت یا ہولی منا کر نہیں بلکہ ایسے انداز سے کیا جاتا ہے جس سے کنار رُکنا باد کی بزم مے نوشی اور گلگشتِ مصلیٰ کا حظ حاصل ہو۔ اور پھر لطف یہ کہ یہ سب کچھ تو ایران میں ہوتا ہے اور بہار ہندوستان میں آجاتی ہے۔ بخلاف اس کے حفیظ کے ہاں بسنت میں سرسوں پھولتی ہے۔ باغوں اور کھیتوں میں ہندوستانی بہار آتی ہے۔ لڑکے ڈور اور پتنگ کے لیے باہم دست و گریباں ہوتے ہیں۔ دوسری جانب ایک عصمت مآب شوہر پرست ہندوستانی

عورت نے پھولوں کے زرد گہنے تو پہن لیے ہیں مگر شوہر پردیس میں ہے اس لیے:

ہے مگر اداس
نہیں پی کے پاس
غم و رنج و یاس
دل کو پڑے ہیں سہنے

اسی طرح برسات آتی ہے تو جہاں باغوں میں بلبلوں کے بجائے کوئل کی کُو کُو اور پپیہے کی پی کہاں سنائی دیتی ہے۔ وہاں آموں کے نیچے جھولے ڈال کر پینگیں بڑھانے والی ماہ پیکروں کے پیارے پیارے گیتوں کی میٹھی رسیلی تانیں بھی فردوس گوش بنتی ہیں۔ ہندوستانی عورت کی نمایاں ترین خصوصیات اس مستی اور الہڑ پنے کی ہڑبونگ میں بھی حفیظ کے پیش نظر رہتی ہیں۔ چنانچہ جھولا جھولنے والیاں ہنستے کھیلتے، مسکراتے، منہ چڑھاتے اور ہلڑ مچاتے یکا یک جھینپ بھی جاتی ہیں۔

اٹھلا، رہی ہیں اترا رہی ہیں
خوبانِ ہندی حوران، ارضی
رونق گھروں کی
نازک دوپٹے رنگین ہلکے
سر پہ سنبھالے شانوں پہ ڈالے
مینہ لاکھ برسے جی لاکھ ترسے
نکلیں نہ گھر سے
شوہر کے ڈر سے
اپنی، نظر سے شرما رہی ہیں

نغمہ زار کی ان نظموں اور جلوہ ءسحر، تاروں بھری رات وغیرہ کو چھوڑ کر سوز و ساز کی نظموں کو دیکھیے تو ان میں بھی یہ مقامی رنگ اسی طرح نمایاں نظر آئے گا۔ پریت کا گیت، چاندنی میں کشتی، شام رنگیں، جاگ سوزِ عشق جاگ اور چناب وغیرہ کو پڑھ کر قدیم اور موجود شاعری سے مقابلہ کیجیے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ یہ حفیظ کی قادرالکلامی اور وجدانِ صحیح کا بڑا ثبوت ہے۔

دنیا بھر کی زبانوں میں گیت کو ذوق و سرمستی اور سوز و گداز کا بہترین مظہر مانا گیا ہے۔ اُردو شاعری میں حفیظ اس مخصوص صنف کا موجد ہے۔ اس کے گیتوں نے اُردو شاعری میں ایک نئی لذت اور ایک نیا رس پیدا کر دیا ہے۔ اس کے قلم نے گیت کو وہ مقام بخشا ہے کہ اُردو زبان ہمیشہ حفیظ کی احسان مندر ہے گی۔

اس طرح اگر ان نظموں کو دیکھیں جو حفیظ نے بچوں کے لیے لکھی ہیں تو شاعری کی اس صنف میں بھی حفیظ کی انفرادیت اوران کی اختراعات مسلم ہیں۔ خصوصاً جو نظمیں صغیر سن بچوں کے لیے ہیں۔ ان میں تو شاعر نے کمال اختراع کا حیرت انگیز ثبوت دیا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اُردو شاعری میں اور کسی شاعر نے ننھے منے بچوں کے لیے ایسی نظمیں نہیں لکھیں۔ جنھیں بچے خود اپنے دل کی آواز کہہ سکیں۔

حفیظ نے بحور اور اوزان کے انتخاب میں جس فنی پختگی اور بالغ نظری کا اور ذوق صحیح کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ''بسنت'' اور ''ابھی تو میں جوان ہوں'' کے چلنت اوزان میں کس قدر مستی ہے کتنا جوش ہے۔ اسی طرح سوز و ساز کی نظموں میں ''فرشتہ کا گیت'' دیکھیے۔ اس کا وزن

آسمانی نغموں کے لیے کس قدر موزوں ہے۔کانوں کے ساتھ دل بھی یہی محسوس کرتا ہے کہ ایک رحمت کا فرشتہ ہاتھ میں چھوٹی سی ستار لیے بے فکری کے عالم میں تانیں اُڑاتا پھر رہا ہے۔

دیکھ اس دنیا کا نظارہ
میرے ساز کے تاروں میں

کلامِ حفیظ سے انتخاب

☆

شاہنامہ اسلام

ختم المرسلینؐ رحمۃ للعالمینؐ

ولادت باسعادت

طلسمِ کُن سے قائم بزمِ ہست وبود ہوجانا
اشارے ہی سے موجودات کا موجود ہوجانا
عناصر کا شعورِ زندگی سے بہرہ ور ہونا
لپٹ کر آب و خاک وباد و آتش کا بشر ہونا
یہ کیا تھا؟ کس لیے، کس کے لیے تھا؟ مدّعا کیا تھا
یونہی تھا یا کوئی مقصد تھا، آخر ماجرا کیا تھا
یہ کس کی جستجو میں مہرِ عالم تاب پھرتا تھا
ازل کے روز سے بے تاب تھا بے خواب پھرتا تھا
یہ کس کی آرزو میں چاند نے سختی سہی برسوں
زمیں پر چاندنی برباد و آوارہ رہی برسوں
یہ کس کے شوق میں پتھرا گئیں آنکھیں ستاروں کی
زمیں کو تکتے تکتے آ گئیں آنکھیں ستاروں کی

کروڑوں رنگتیں ، کس کے لیے ایام نے بدلیں
پیاپے گردشیں کس دھن میں صبح و شام نے بدلیں
یہ کس کے واسطے مٹی نے سیکھا گل فشاں ہونا
گوارا کرلیا پھولوں نے پامالِ خزاں ہونا
یہ سب کچھ ہو رہا تھا ایک ہی امید کی خاطر
یہ ساری خواہشیں تھیں ایک صبحِ عید کی خاطر
خلیل اللہؑ نے جس کے لیے حق سے دعائیں کیں
ذبیح اللہؑ نے وقت ذبح جس کی التجائیں کیں
جو بن کر روشنی پھر دیدۂ یعقوبؑ میں آیا
جسے یوسف نے اپنے حسن کے نیرنگ میں پایا
کلیم اللہ کا دل روشن ہوا جس ضو فشانی سے
وہ جس کی آرزو بھڑکی جوابِ لن ترانی سے
وہ جس کے نام سے داؤد نے نغمہ سرائی کی
وہ جس کی یاد میں شاہِ سلیماں نے گدائی کی
دلِ یحییٰ میں ارماں رہ گئے جس کی زیارت کے
لبِ عیسیٰ پہ آئے وعظ جس کی شانِ رحمت کے
وہ دن آیا کہ پورے ہوگئے تورات کے وعدے
خدا نے آج ایفا کردیے ہر بات کے وعدے
مرادیں بھر کے دامن میں مناجاتِ زبور آئی
سحر کی روشنی پڑتی ہوئی آیاتِ نور آئی
نظر آئی بالآخر معنیٔ انجیل کی صورت
ودیعت ہوگئی انسان کو تکمیل کی صورت

ربیع الاوّل امیدوں کی دُنیا ساتھ لے آیا
دعاؤں کی قبولیت کو ہاتھوں ہاتھ لے آیا
خدا نے ناخدائی کی خود انسانی سفینے کی
کہ رحمت بن کے چھائی بارہویں شب اس مہینے کی
ازل کے روز جس کے دھوم تھی وہ آج شب تھی
جو قسمت کے لیے مقسوم تھی وہ آج کی شب تھی
مشیّت ہی کو جو معلوم تھی وہ آج کی شب تھی
ارادے ہی میں جو مرقوم تھی وہ آج کی شب تھی
سمندر موتیوں کو دامنوں میں بھر کے بیٹھے تھے
جبل لعل وجواہر کو مہیا کر کے بیٹھے تھے
ہوائیں پے بہ پے اک سرمدی پیغام لاتی تھیں
کوئی مژدہ تھا جو ہر گوشِ گل میں کہہ سناتی تھی
گلے پھولوں سے ملتے جا رہے تھے پھول گلشن کے
گلے مل مل کے کھلتے جا رہے تھے پھول گلشن کے
تبسم ہی تبسم تھے، نظارے لالہ زاروں کے
ترنم ہی ترنم تھے کنارے جوئے باروں کے
ندا آئی دریچے کھول دو ایوانِ قدرت کے
نظارے خود کرے گی آج قدرت شانِ قدرت کے
یکا یک ہو گئی ساری فضا تمثالِ آئینہ
نظر آیا معلّق عرش تک اک نور کا زینہ
خدا کی شانِ رحمت کے فرشتے صف بہ صف اُترے

پرے باندھے ہوئے سب دین و دنیا کے شرف اُترے
سحابِ نور آکر چھا گیا مکے کی بستی پر
ہوئی پھولوں کی بارش ہر بلندی اور پستی پر
ہوا عرشِ معلیٰ سے نزول ِ رحمتِ باری
تو استقبال کو اٹھی حرم کی چار دیواری
صدا ہاتف نے دی اے ساکنانِ خطہء ہستی
ہوئی جاتی ہے پھر آباد یہ اُجڑی ہوئی بستی
مبارک باد ہے اُن کے لیے جو ظلم سہتے ہیں
کہیں جن کو امان ملتی نہیں برباد رہتے ہیں
ضعیفوں بے کسوں، آفت نصیبوں کو مبارک ہو
یتیموں کو ، غلاموں کو، غریبوں کو مبارک ہو
خبر جا کر سنا دو شش جہت کے زیر دستوں کو
زبردستی کی جرأت اب نہ ہوگی خود پرستوں کو
مبارک ہو کہ دورِ راحت و آرام آپہنچا
نجاتِ دائمی کی شکل میں اسلام آپہنچا
مبارک ہو کہ ختم المرسلینؐ تشریف لے آئے
جنابِ رحمۃ للعالمینؐ تشریف لے آئے
بصد اندازِ یکتائی، بغایت شانِ زیبائی
امیںؐ بن کر امانت آمنہ کی گود میں آئی
فرشتوں کی سلامی دینے والی فوج گاتی تھی
جنابِ آمنہ سنتی تھیں، یہ آواز آتی تھی

☆

سلام

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات، فخرِ نوع انسانی
سلام اے ظلِ رحمانی، سلام اے نورِ یزدانی
ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی
سلام اے سرِ وحدت اے سراجِ بزم ایمانی
زہے یہ عزت افزائی ، زہے تشریف ارزانی
ترے آنے سے رونق آ گئی گلزارِ ہستی میں
شریکِ حالِ قسمت ہوگیا پھر فضلِ ربانی
سلام اے صاحبِ خلقِ عظیم، انساں کو سکھلا دے
یہی اعمالِ پاکیزہ، یہی اشغالِ روحانی
تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ
تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی
اگرچہ فقر فخری رتبہ ہے تیری قناعت کا
مگر قدموں تلے ہے فقرِ کسرائی و خاقانی
زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہوچکی اجزائے ہستی کی پریشانی
زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہوجائے
ترے پرتو سے مل جائے ہر اک ذرّے کو تابانی
حفیظِ بے نوا بھی ہے گدائے کوچہ ء الفت
عقیدت کی جبیں، تیری مروت سے ہے نورانی

ترا در ہو مرا سر ہو، مرا دل ہو ترا گھر ہو
تمنا مختصر سی ہے، مگر تمہید طولانی
سلام اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

☆

میرا سَلام لے جا

قسمت کے آسماں پر سیمائے کہکشاں پر
چمکا ترا ستارا
اُس در پہ حاضری کا تجھ کو ہوا اشارا
اے بختیار بندے
اے کامگار بندے
تیری مراد مندی تقدیر کی بلندی
تجھ کو پکارتی ہے
آ باریاب ہو جا
اے ذرّہ ء محبت جا آفتاب ہو جا
دربار میں چلا ہے
سرکار میں چلا ہے
رختِ سفر اٹھا لے اللہ کے حوالے
یثرب کے جانے والے بس اک پیام لے جا
میرا سلام لے جا

☆

ابھی تو میں جوان ہوں

ہوا بھی خوشگوار ہے گلوں پہ بھی نکھار ہے
ترنمِ ہزار ہے بہار پُر بہار ہے
کہاں چلا ہے ساقیا اِدھر تو لوٹ، ادھر تو آ
ارے یہ دیکھتا ہے کیا اُٹھا سبو، سبو اُٹھا
سبو اُٹھا، پیالہ بھر پیالہ بھر کے دے اِدھر
چمن کی سمت کر نظر سماں تو دیکھ بے خبر
وہ کالی کالی بدلیاں اُفق پہ ہو گئیں عیاں
وہ اک ہجومِ مے کشاں ہے سوئے میکدہ رواں
یہ کیا گماں ہے بدگماں سمجھ نہ مجھ کو ناتواں

خیالِ زہد ابھی کہاں
ابھی تو میں جوان ہوں

☆

عبادتوں کا ذکر ہے نجات کی بھی فکر ہے
خیال ہے عذاب کا جنون ہے ثواب کا
مگر سنو تو شیخ جی عجیب شے ہیں آپ بھی
بھلا شباب و عاشقی الگ ہوئے بھی ہیں کبھی
حسین جلوہ ریز ہوں ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نگار ہائے فتنہ گر کوئی ادھر، کوئی اُدھر

اُبھارتے ہوں عیش پر — تو کیا کرے کوئی بشر
چلو جی قصہ مختصر — تمھارا نقطۂ نظر
درست ہے تو ہو مگر
ابھی تو میں جوان ہوں

☆

یہ گشت کوہسار کی — یہ سیر جُوئبار کی
یہ بلبلوں کے چہچہے — یہ گل رخوں کے قہقہے
کسی سے میل ہو گیا — تو رنج و فکر کھو گیا
کبھی جو بخت سو گیا — یہ ہنس گیا وہ رو گیا
یہ عشق کی کہانیاں — یہ رس بھری جوانیاں
ادھر سے مہربانیاں — ادھر سے لن ترانیاں
یہ آسمان، یہ زمیں — نظارہ ہائے دل نشیں
انھیں حیات آفریں — بھلا میں چھوڑ دوں یہیں
ہے موت اس قدرقریں — مجھے نہ آئے گا یقیں
نہیں نہیں، ابھی نہیں
ابھی تو میں جوان ہوں

☆

رقاصہ

اُٹھی ہے مغرب سے گھٹا — پینے کا موسم آ گیا
ہے رقص میں اک مہ لقا — نازک ادا ناز آفریں
ہاں ناچتی جا گائے جا — نظروں سے دل برمائے جا

تڑپائے جا، تڑپائے جا　　اور دشمن دُنیا و دیں
تیرا تھرکنا خوب ہے　　تیری ادائیں دل نشیں
لیکن ٹھہر تُو کون ہے　　اور نیم عریاں نازنیں
کیا مشرقی عورت ہے تُو　　ہر گز نہیں، ہرگز نہیں

تیری ہنسی بے باک ہے
تیری نگہہ چالاک ہے

اف کس قدر دل سوز ہے　　تقریر بازاری تری
کتنی ہوس آموز ہے　　یہ سَادہ پُرکاری تری

نخلِ وفا کی ڈالیاں
ہوتی ہیں عفت والیاں

وہ حُسن کی شہزادیاں　　پردے کی ہیں آبادیاں
چشمِ فلک نے آج تک　　دیکھی نہیں ان کی جھلک
سرمایہء شرم و حیا　　زیور ہے ان کے حسن کا
شوہر کے دکھ سہتی ہیں وہ　　منہ سے نہیں کہتی ہیں وہ
کب سامنے آتی ہیں وہ　　غیرت سے کٹ جاتی ہیں وہ
اعزازِ ملت، اُن سے ہے　　نامِ شرافت اُن سے ہے
اسلام پر قائم ہیں وہ　　پاکیزہ و صائم ہیں وہ

تجھ میں نہیں شرم و حیا
تجھ میں نہیں مہر و وفا

سچ سچ بتا تو کون ہے　　او بے حیا تو کون ہے
احساسِ عزت کیوں نہیں　　شرم اور غیرت کیوں نہیں

☆

ہندوستاں کی روشنی

جمعیتِ اسلامیاں شاہنشہِ ہندوستاں
اب اس میں دَم کچھ بھی نہیں ہم کیا ہیں، ہم کچھ بھی نہیں
ملّی سیاست اٹھ گئی بازو کی طاقت اٹھ گئی
شانِ حجازی اب کہاں وہ ترکتازی اب کہاں
اب غزنوی ہمت گئی اب بابری شوکت گئی
ایمان عالم گیر کا مسلم کے دل سے اُٹھ گیا
قوم اب جفا پیشہ ہوئی بلکہ گدا پیشہ ہوئی
اب رنگ ہی کچھ اور ہے بے غیرتی کا دور ہے
یہ قوم اب مٹنے کو ہے یہ نرد اب پٹنے کو ہے

افسوس یہ ہندوستاں!
یہ گلشنِ جنت نشاں!

☆

فرصت کی تمنا میں

یوں وقت گزرتا ہے
فرصت کی تمنا میں
جس طرح کوئی پتّا
بہتا ہوا دریا میں
ساحل کے قریب آ کر
چاہے کہ ٹھہر جاؤں

اور سیر ذرا کر لوں
اِس عکسِ مشجر کی
جو دامنِ دریا پر
زیبائشِ دریا ہے
یا باد کا وہ جھونکا
جو وقفِ روانی ہے
اک باغ کے گوشے میں
چاہے کہ یہاں دَم لوں
دامن کو ذرا بھر لوں
اُس پھول کی خوشبو سے
جس کو ابھی کھلنا ہے
فرصت کی تمنّا میں
یوں وقت گزرتا ہے
افکار معیشت کے
فرصت ہی نہیں دیتے
میں چاہتا ہوں دل سے
کچھ کسبِ ہنر کر لُوں
گلہائے مضامیں سے
دامانِ سخن بھر لُوں
ہے بخت مگر واژوں
فرصت ہی نہیں ملتی

فرصت کو کہاں ڈھونڈوں
فرصت ہی کا رونا ہے
پھر جی میں یہ آتی ہے
کچھ عیش ہی حاصل ہو
دولت ہی ملے مجھ کو
وہ کام کوئی سوچوں
پھر سوچتا یہ بھی ہوں
یہ سوچنے کا دھندا
فرصت ہی میں ہونا ہے
فرصت ہی نہیں دیتے
افکار معیشت کے

☆

جاگ سوزِ عشق

جاگ سوزِ عشق جاگ!
تُونے آنکھ بند کی کائنات سو گئی
حسنِ خود پسَند کی دن سے رات ہوگئی
زرد پڑ گیا سُہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!
تو جو چشم وا کرے ہر اُمنگ جاگ اٹھے

آہ و نالہ جاگ اٹھے　　　راگ رنگ جاگ اٹھے

جوگ سے ملے بہاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ اے نظر فروز!　　　جاگ اے نظر نواز!

جاگ اے زمانہ سوز　　　جاگ اے زمانہ ساز

جاگ نیند کو تیاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!

☆

دِل ہے پرائے بس میں

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

پورب میں جاگا ہے سویرا　　　دُور ہوا دنیا کا اندھیرا

لیکن گھر تاریک ہے میرا

پچھّم میں جاگی ہیں گھٹائیں　　　پھرتی ہیں سرمست ہوائیں

جاگ اٹھو مے خانے والو　　　پینے اور پلانے والو

زھر ملاؤ رس میں

دل ہے پرائے بس میں

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

بیت گیا دن رات بھی آئی تاروں نے محفل بھی سجائی

اُس نے مگر صورت نہ دکھائی

وہم کئی ٹالے ہیں میں نے تارے گن ڈالے ہیں میں نے

وعدے کا تو کس کو یقیں ہے آنکھ میں لیکن نیند نہیں ہے

نیند نے کھا لیں قسمیں

دل ہے پرائے بس میں

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

دوستو اس کا نام نہ پوچھو کچھ بھی نہیں ہے کام نہ پوچھو

مجھ سے کوئی پیغام نہ پوچھو

میرا کبھی تم نام نہ لینا مل جائے تو یوں کہہ دینا

اک دیوانہ چُپ رہتا ہے کہتا ہے تو یہ کہتا ہے

دل ہے پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

☆

پریت کا گیت

(۱)

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسالے — او مُورکھ او بھولے بھالے
دل کی دنیا کر لے روشن — اپنے گھر میں جوت جگا لے
پریت ہے تیری ریت پرانی — بھول گیا او بھارت والے
بھول گیا او بھارت والے
پریت ہے تیری ریت
بسا لے
اپنے من میں پریت

(۲)

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اُترا ڈیرا — چھایا چاروں کھونٹ اندھیرا
شیخ برہمن دونوں رہزن — ایک سے بڑھ کر ایک لُٹیرا
ظاہرداروں کی سنگت میں — کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
من ہے تیرا میت
بسا لے
اپنے من میں پریت

(۳)

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت

بھارت ماتا ہے دکھیاری دکھیارے ہیں سب نر ناری
تو ہی اُٹھالے سندر مُرلی تو ہی بن جا شام مراری
تو جاگے تو دنیا جاگے جاگ اٹھیں سب پریم پجاری

جاگ اٹھیں سب پریم
پجاری
گائیں تیرے گیت
بسا لے
اپنے من میں پریت

(۴)

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت

نفرت اک آزار ہے پیارے دکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آجا اپنے روپ میں آ جا توہی پریم اوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا من کے ہارے ہار ہے پیارے

من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے جیتے جیت
بسا لے
اپنے من میں پریت

(۵)

اپنے من میں پریت

بسا لے

اپنے من میں پریت

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے سر جائے پر میت نہ جائے

میں ڈرتا ہوں کوئی تیری جیتی بازی جیت نہ جائے

جو کرنا ہو جلدی کر لے تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

وقت نہ جائے بیت

بسا لے

اپنے من میں پریت

☆

اپنے وطن میں

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

حُسن و نظر کی خاموش گھاتیں

عشق و ہوس کی دُھومیں براتیں

سب ہیں وہاں بھی یہ وارداتیں

دیکھی نہیں کیا تو نے وہ راتیں

دولہا دلہن جب

کرتے ہیں باتیں

ہنستی ہیں کلیاں کھلتے ہیں تارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن کے دن رات نیارے

وہ چاند سُورج نوری غبارے

وہ ندیاں ہیں امرت کے دھارے

دنیا سے اُونچے پربت ہمارے

باغ اور آکاش

پھول اور تارے

سب منتظر ہیں میرے تمھارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

وہ سیدھی سادی بچوں کی مائیں

زلفیں ہیں جن کی کالی گھٹائیں

آنچل میں جن کے ٹھنڈی ہوائیں

بھُولو گے کب تک اُن کی وفائیں
کب تک کرو گے
اُن پر جفائیں
چھوڑا ہے اُن کو کِس کے سہارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے
ماضی سے بہتر بے شک نہیں حال
عِلم و ہنر کا پھر بھی نہیں کال
ٹیگور کا ساز جادوئے بنگال
پنجاب کا ناز اعجازِ اقبال
اور یہ مُسافر

☆

تصویرِ کشمیر

(ایک طویل نظم کے چند بند)

(۱)

برف کی اُونچائیاں، برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بو کی شوخیاں پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پہ دیوداروں کی بزم آرائیاں
بنتے تنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں

آگے پیچھے دوڑتا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۲)

ندیاں ہر سُو تھرکتی ناچتی گاتی ہوئی
کسمساتی لڑکھڑاتی، پیچ بل کھاتی ہوئی
آدمی کیا پتھروں کو وجد میں لاتی ہوئی
اپنی اپنی منزلِ مقصود کو جاتی ہوئی
کرتی جاتی ہیں نگاہوں پر عمل تسخیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۳)

تا بہ دامانِ نظر چیلوں کے دیوداروں کے بن
سینۂ ہر سنگِ خارا سے رواں نہر لبن
بوالہوس کے واسطے لیکن یہ رستے ہیں کٹھن
مر گیا سر پھوڑ کر ان پتھروں سے کوہکن
سُن لیا تھا نام بے چارے نے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۴)

عامیوں نے کہہ دیا کشمیر کو جنت نشاں
ورنہ جنت میں یہ حسن و رنگ و شادابی کہاں
کیا ہے جنت ، چند حوریں، اک چمن دو ندیاں
خیر زاہد کی رعایت سے یہ کہتا ہوں کہ ہاں

عالمِ بالا پہ ہے پَر تو اسی کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۵)

حُسن کی افراط، خوبی کی فراوانی یہاں
ہے نظر کو اعترافِ تنگ دامانی یہاں
بہر جان و جسم ہر نعمت کی ارزانی یہاں
بے کس و محتاج لیکن نوعِ انسانی یہاں
نقش فریادی ہے یہ تقدیر کی تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۶)

اک طرف مہمان خوش اوقات خوش دل خوش لباس
ایک جانب میزبان! فاقہ زدہ تصویرِ یاس
اک طرف مے کا نشہ پھل کا مزہ، پھولوں کی باس
اک طرف بے کیف مزدوری کا حاصل بھوک پیاس
اک تماشائی ہے اک فرزند ہے کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۷)

جس کی محنت سے چمن میں روئے گل پر خندہ ہے
اس کا گھر تاریک اس کا اپنا منظر گندہ ہے
نقش صنّاعی کا جس کی لوحِ دل پر کندہ ہے
اس کی مجبوری کو دیکھو بندگی کا بندہ ہے

سانس لینے میں بھی اُس کو خوف ہے تعزیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۸)

یہ چمن اغیار کی شعلہ خرامی کے لیے
یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کے لیے
زندگانی ہے یہاں مرگِ دوامی کے لیے
مائیں جنتی ہیں یہاں بچے غلامی کے لیے
ہر نفس اک سلسلہ ہے قید بے زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۹)

اس سے بڑھ کر اور کچھ چاہے تو شالا مار دیکھ
آنکھ رکھتا ہے تو یہ رنگِ گل و گلزار دیکھ
کچھ نہیں دیکھا ابھی پھر دیکھ پھر ایک بار دیکھ
شانِ مغلیہ کے یہ مٹتے ہوئے آثار دیکھ
تو نے دیکھا ہے کہیں ایسا بھی فن تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۱۰)

چشمِ شاعر کے ہیں آنسو ان کو مٹی میں نہ رول
بے خبر انمول جوھر کو ترازو میں نہ تول
ایک گوشے میں ادب سے بیٹھ جا منہ سے نہ بول
او تماشائی! تصور شرط ہے آنکھیں نہ کھول

چشمِ دل سے دیکھ نقشہ گردشِ تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۱۱)

ہے عجب دھندلی ضیا اُجلا اندھیرا باغ میں
ہر چمن کو نور پوشوں نے ہے گھیرا باغ میں
ہے شناسا اب کوئی تیرا نہ میرا باغ میں
بانیانِ باغ کا اُترا ہے ڈیرا باغ میں
خوف ہے تعزیر کا اِن کو نہ دار و گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۱۲)

کیا مجالِ دم زدن شاہوں کے ارشادات پر
شاہدِ عادل ہے تاریخ ان کے احسانات پر
کاش وہ مرکوز ہوتی آدمی کی ذات پر
پھر بجا ہوتا گلہ کوتاہیء تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۱۳)

نسلِ انسانی کو ٹھہرایا گیا بے کار و زشت
رائیگاں ہوتی رہی مزدور کی زرخیز کشت
رنگ و نغمہ ساغر و مل سبزہ و گل، سنگ و خشت
خواب دیکھا منہ نہ دیکھا خواب کی تعبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۱۴)

اہلِ زر کشمیریوں کے حال پر ہنستے ہیں آج
نام ہے ان کا فریبی حیلہ گر روبہ مزاج
بے دلی، بے اعتمادی، مفلسی اور احتیاج
بندگی صد ہا برس کی اور مسلسل سامراج
کس قدر ساماں فراہم ہے یہاں تحقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

☆

جزیرے

قافلے برباد ہو کر رہ گئے ، تو کیا ہوا
مطمئن ہیں قافلہ سالار اپنے کام سے
عہدہ و منصب کی بازی جیت کر گھڑ دوڑ میں
تھان پر ہیں درشنی گھوڑے بڑے آرام سے
قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

رہنماؤں کو سجا کر منزلِ مقصود پر
ٹھوکریں کھاتا ہے تاریکی میں امت کا جلوس
جن بہشتی مقبروں پر ہو گئے روشن چراغ
ملّتِ بیضا یہی تھے چند گنتی کے نفوس
قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

کیوں گروہِ عام کی ذلّت کا غم کھائیں خواص
جن کو اس ذلّت میں لذّت کے ذخیرے مل گئے

کشتیاں گرداب میں چھوڑیں، خدا حافظ کہا
ناخدا خوش ہیں کہ ان کو تو جزیرے مل گئے

☆

حفیظ کی غزلوں سے چند اشعار

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمھیں بھلا سکے

ایسا ہو کوئی نامہ بر، بات پہ کان دھر سکے
سن کے یقین کر سکے، جا کے اُنھیں سنا سکے

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ، درد کے گیت گا سکے

....

کوئی چارہ نہیں دعا کے سوا
کوئی سنتا نہیں خدا کے سوا

مجھ سے کیا ہو سکا وفا کے سوا
مجھ کو ملتا بھی کیا سزا کے سوا

....

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

بلا کافی نہ تھی اک زندگی کی
دوبارہ یاد فرمایا گیا ہوں

سپردِ خاک ہی کرنا تھا مجھ کو
تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

مجھے تو اس خبر نے کھو دیا ہے
سُنا ہے میں کہیں پایا گیا ہوں

ہوں اس کوچے کے ہر ذرے سے واقف
اِدھر سے بارہا آیا گیا ہوں

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

....

ہنسنے کا اعتبار نہ رونے کا اعتبار
کیا زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہوں میں

ہاں کیفِ بےخودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہوں میں

ہمت بلند تھی، مگر اُفتاد دیکھنا
چُپ چاپ آج میں محوِ دعا ہو گیا ہوں میں

واقف نہیں ہیں رتبہء دیوانگی سے دوست
کم بخت جانتے ہیں کیا ہو گیا ہوں میں

....

کرتا ہے تصور مرا اس رنگ کی باتیں
سن لے کوئی اک حرف تو افسانہ بنا دے

دیوانگیء عشق کے بعد آ ہی گیا ہوش
اور ہوش بھی وہ ہوش کہ دیوانہ بنا دے

آخر کوئی صورت تو بنے خانہ ء دل کی
کعبہ نہیں بنتا ہے تو بتخانہ بنا دے

....

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو میری نیت خراب ہے

او مبتلائے زیست ٹھہر! خود کُشی نہ کر
تیرا علاج زہر نہیں ہے شراب ہے

ساقی تری نظر نے یہ کیا کر دیا مجھے
جیسے رگوں میں خون نہیں ہے شراب ہے

....

ناکامی ء عشق یا ناکامی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی

ہیں تختِ دل پر سرکار ورنہ
تختہ اُلٹ دیں ہم انقلابی

....

پیشِ خدا چلا ہوں، فرشتے ہیں ساتھ ساتھ
ساغر لیے ہوئے، کوئی مینا لیے ہوئے

....

تیرا پھولوں کا بستر بھی، راہ گزارِ سیل میں ہے
آقا اب یہ بندے ہی کے خار وخس کی بات نہیں

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

....

روزِ روشن کو ہوں میں رات سمجھنے والا
ہے کوئی آج مری بات سمجھنے والا

دورِ صاحب نظراں اور ہے یہ دور نہیں
ہم بزرگوں کے مقامات سمجھنے والا

اس نئے دورِ سُخن سے ہے پریشان حفیظ
شعر کو حرف و حکایات سمجھنے والا

....

اب تو پہلے سے بھی اندھیرا ہے
واہ کیا دیدنی سویرا ہے

راہ زنوں سے تو بھاگ نکلا تھا
اب مجھے راہبروں نے گھیرا ہے

راہبرو مجھ کو یہ تو بتلا دو
کون سب سے بڑا لٹیرا ہے

....

کیسے بند ہوا میخانہ اب معلوم ہوا
پی نہ سکا کم ظرف زمانہ اب معلوم ہوا

خالی شیشے طاق پہ دھرتا جاتا ہے ساقی
بھرتا جاتا ہے پیمانہ اب معلوم ہوا

....

حسن پابندِ رضا ہو مجھے منظور نہیں
میں کہوں تم مجھے چاہو مجھے منظور نہیں

جس نے اس دور کے انساں کیے پیدا
وہی میرا بھی خدا ہو مجھے منظور نہیں

....

کسی سے عشق ہو سچ مچ کوئی ضرور نہیں
فقط کرشمۂ حسنِ بیاں بھی ہوتا ہے

حفیظ موت تو اپنی بس اک بہانہ تھی
یہ دیکھنا تھا کوئی نوحہ خواں بھی ہوتا ہے

....

بچوں کے لیے
حفیظ کے گیت اور نظمیں

حمد

اے دو جہاں کے والی!
اے گلشنوں کے مالی!
ہر چیز سے ہے ظاہر حکمت تری نرالی
تیرے ہی فیض سے ہے سرسبز ڈالی ڈالی
یہ سلسلہ جہاں کا
دنیا کے گلستاں کا

پھولوں بھری زمیں کا　　تاروں کا آسماں کا
سارا ہے کام تیرا　　پیارا ہے نام تیرا

یہ خاک آگ پانی
ہے تیری مہربانی

ہر دم ہوا کے لب پر　　ہے تیری ہی کہانی
ہے دم قدم سے تیرے　　دریاؤں میں روانی

ہر بحر اور بر میں
ہر خشک اور تر میں

ہر بیج اور شجر میں　　ہر شاخ اور ثمر میں
ہے فیض عام تیرا　　پیارا ہے نام تیرا

تو نے ہمیں بنایا
اور سوچنا سکھایا

ہر شے پہ ہم نے دیکھا　　تیرے کرم کا سایا
جس راستے میں ڈھونڈا　　تیرا نشان پایا

انسان بھی ہیں تیرے
حیوان بھی ہیں تیرے

جاں دار بھی ہیں تیرے　　بے جان بھی ہیں تیرے
ہر اک غلام تیرا　　پیارا ہے نام تیرا

تاروں بھری رات

لو رات آئی
دُنیا پہ چھائی
نیندوں نے آ کر ڈالا ہے ڈیرا
آنکھوں میں ایسا کاجَل بکھیرا
سارے جہاں میں
چھایا اندھیرا
اکثر گھروں کی ہے روشنی گُل
کھیت اور جنگل تاریک بالکل
انسان، حیوان
جاں دار، بے جان
چُپ ہو رہے ہیں یا سو رہے ہیں
لو رات آئی
دنیا پہ چھائی

اے سونے والو!
چَادر ہٹا لو
دیکھو فلک پر روشن ہیں تارے
چہرے ہیں ان کے کیا پیارے پیارے
ہیں قابلِ دید
ان کے نظارے

ہے آسماں بھی کیا صاف سُتھرا
اک نیلی نیلی چادر ہے گویا
جس پر سجی ہے
بیٹھی ہوئی ہے
پُر نُور محفِل مسرُور محفِل
اے سونے والو!
چادر ہٹا لو

ہے یہ نظّارا
دن سے بھی پیارا
اک کھیت ہے یہ جس میں خدا نے
دنیا کی خاطر بوئے ہیں دانے
اور چاہتا ہے
سُورج اُگا لے
یا سائباں پر ہیرے جڑے ہیں
یا چھت پہ موتی بکھرے پڑے ہیں
یا ایک لشکر
میداں کے اندر
اُترا ہے آ کر شمعیں جلا کر
دن سے بھی پیارا
ہے یہ نظّارا

ہے کیا چمک دار
تاروں کا دربار

پھیلے ہوئے ہیں تارے ہی تارے
رہتے ہیں یُوں تو خاموش سارے
کرتے ہیں لیکن
باہم اشارے

ندّی کے اندر مُنہ دیکھتے ہیں
اور دل ہی دل میں خوش ہو رہے ہیں
دریا کی لہریں
پانی کی نہریں
کیا سَج رہی ہیں تاروں بھری ہیں
ہے کیا چمک دار
تاروں کا دربار

اے پیارے تارو
شب کے دُلارو!
ہاں صبح تک تم چمکے ہی جاؤ
بھٹکے ہوؤں کو رستہ دِکھاؤ
ہم کو بھی ایسی
خِدمت سِکھاؤ
نیکی کریں ہم اور نام چمکے
تاروں کی مانند ہر کام چمکے

ہم کو سلیقہ
آ جائے ایسا
دُنیا کو ہم سے آرام پہونچے
اے پیارے تارو
شب کے تارو!

☆

دُھنیا

فِندک فِندک فِندک فک
دُھنک دُھنک دُھن دُھنک دُھنک

تانت بجی اور نکلا راگ
روئی بنی صابن کا جھاگ
کیسی چھنتی جاتی ہے
بادل بنتی جاتی ہے
کتنا ڈھیر ہوا آہا!
میں اس ڈھیر پہ کُودوں گا
کوئی چوٹ نہ آئے گی
روئی مگر دب جائے گی
اِتی رُوئی ہو گئی صاف
بھر لے تکیے اور لحاف
اِن سے سب سُکھ پاتے ہیں

اوڑھتے اور بچھاتے ہیں
ملتا ہے سب کو آرام
واہ رے دُھنیے تیرا کام

فِندک فِندک فِندک فک
دُھنک دُھنک دُھن دُھنک دُھنک

حفیظ کی تصانیف

نظم:

۱۔	پہلا مجموعہ ءکلام،	''نغمہ زار''	۱۹۲۵ء
۲۔	دوسرا مجموعہ ءکلام	''سوز وساز''	۱۹۳۲ء
۳۔	تیسرا مجموعہ ءکلام	''تلخابہ ءشیریں''	۱۹۴۷ء
۴۔	سلام	کتابچہ	۱۹۲۴ء
۵۔	رقاصہ	کتابچہ	۱۹۲۶ء
۶۔	پردہ اور تعلیم	کتابچہ	۱۹۲۷ء
۷۔	ہندوستاں ہمارا (ہندوستان کی منظوم تاریخ)		۱۹۲۷ء
۸۔	یہ ہماری انجمن	کتابچہ	۱۹۲۸ء
۹۔	تصویر کشمیر (طویل نظم)	کتابچہ	۱۹۳۷ء
۱۰۔	شاہ نامہ اسلام		
	جلد اوّل		۱۹۲۸ء
	جلد دوم		۱۹۳۲ء
	جلد سوم		۱۹۴۰ء
	جلد چہارم		۱۹۴۷ء
۱۱۔	حفیظ کے گیت اور نظمیں (چار حصے)		۱۹۳۹ء
۱۲۔	بزم نہیں رزم (کشمیر کے بارے میں نظمیں)		۱۹۷۳ء
۱۳۔	چراغ سحر چوتھا مجموعہ ءکلام		۱۹۷۴ء

نثر:

۱۔ ہفت پیکر (افسانے) ۱۹۲۹ء

۲۔ معیاری افسانے (انگریزی سے تراجم) ۱۹۳۳ء

۳۔ بقلم خود (ایک نامکمل آپ بیتی) ۱۹۵۳ء

۴۔ حفیظ تاشقند میں (سفرنامہ) ۱۹۶۳ء

۵۔ چیونٹی نامہ ۱۹۷۳ء

۶۔ نثرانے (تاثراتی تحریریں) ۱۹۷۶ء

۷۔ حفیظ کے خطوط (غیر مطبوعہ)

بچوں کے لیے نثر میں کتابیں:

۸۔ عمرو عیار (طلسم ہوشربا سے ماخوذ) ۱۹۲۶ء

۹۔ شہزادہ صنم اور جنوں کا بادشاہ ۱۹۸۲ء

۱۰۔ شہزادہ خداداد اور شہزادی دریاباد ۱۹۸۲ء

۱۱۔ حفیظ نے اپنے احباب کو سینکڑوں کی تعداد میں خطوط لکھے جو ابھی تک کتابی شکل میں مرتب نہیں ہوئے۔

۱۲۔ روزنامہ جنگ میں ایک عرصہ تک ''جنگ و آہنگ'' کے زیرِ عنوان ہفت روزہ کالم لکھتے رہے۔

☆☆............☆☆

حوالہ جات

۱۔ حفیظ، ایک پیاری عظیم شخصیت۔از شاہد احمد دہلوی، ماہنامہ افکار، حفیظ نمبر، صفحہ ۱۹۵

۲۔ حفیظ، ایک نئی آواز۔از سید ضمیر جعفری افکار حفیظ نمبر، صفحہ ۵۱۵

۳۔ دیباچہ، نغمہ زار، مطبوعہ ۱۹۲۵ء

۴۔ شاعر شباب، از ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، افکار، حفیظ نمبر

۵۔ ماہ نامہ نگار، جنوری۔فروری ۱۹۴۱ء صفحہ ۱۱۵

۶۔ ایضاً

۷۔ حفیظ جالندھری۔از ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، انسائیکلو پیڈیا پنجاب یونیورسٹی لاہور

۸۔ نگار، جنوری۔فروری ۱۹۴۱ء

۹۔ ایضاً

۱۰۔ بقلم خود

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ہزار داستان۔از علی سفیانی آفاقی قسط ۲۲۱، فیملی میگزین ۴ تا ۱۰ اپریل ۲۰۱۰ء

۱۴۔ مخدومی۔از محمد طفیل مدیر نقوش لاہور، صفحہ ۱۲۰

۱۵۔ بقلم خود، نغمہ زار ایڈیشن ۱۹۷۵ء

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ مخدومی از محمد طفیل

۱۸۔ ماہ نامہ افکار، حفیظ نمبر

۱۹۔ ایضاً،صفحہ ۲۴۷

۲۰۔ حفیظ۔از دوارکا داس شعلہ،افکار،حفیظ نمبر ۱۵۰

۱۲۔ بقلم خود،از حفیظ

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ افکار،حفیظ نمبر

مقتدرہ قومی زبان نے ادارے کے دوسرے اہم وظائف کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ اُردو کے بنیادگزاروں کو یاد رکھا جانا چاہیے تاکہ آئندہ نسلوں کو اُن کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات سے آگاہ کیا جاسکے۔ مشاہیر اُردو کے عنوان سے پیش نظر سلسلۂ مطبوعات کا آغاز کیا گیا ہے جس میں اُردو کے محسنوں اور بنیادگزاروں کی اُردو کے لیے خدمات پر تعارفی نوعیت کی مختصر مگر جامع کتابیں شائع کی جائیں گی۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری اُردو کے عہد ساز شاعر ہیں مگر ان کی شناخت جہاں شاعری قرار پاتی ہے وہاں قومی ترانے کے خالق کی حیثیت سے ان کا تشخص قومی حوالوں سے اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنی شاعری کے ذریعے ہر طبقے کو متاثر کرتے ہیں وہاں شاہنامۂ اسلام کے ذریعے اپنے علمی امتیاز کو بھی منواتے ہیں۔ اُردو گیت نگاری کے میدان میں حفیظ جالندھری کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بلاشبہ حفیظ جالندھری اُردو کے شعری منظر پر بے حد نمایاں مقام و مرتبے کے حامل شاعر ہیں۔ جمیل یوسف اُردو غزل کے بہت نمایاں شاعر ہیں اور صاحبِ نظر نقاد بھی۔ انھوں نے مقتدرہ قومی زبان کے سلسلۂ مطبوعات مشاہیر اُردو کے لیے ابوالاثر حفیظ جالندھری کے احوال و آثار پر محیط یہ کتاب لکھ کر اُردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔